سبطِ حسن

شہرِ نگاراں

شہرِ نگاراں

سیّد سبطِ حسن

دانیال

فہرست

تمہید

۱۹۳۹ء کا ذکر ہے میں حیدر آباد دکن سے دِلّی گیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی صاحب کے دستِ راست اور میرے ہم درس رفیق الدین احمد، ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ رفیق کے مہمان ہونے کے علاوہ حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے میں، مولوی صاحب اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی سے تقریباً ہر روز ملتا تھا۔ لال قلعہ مجھے کیفی آنجہانی ہی نے دکھایا اور اس کی ایک ایک بات نہایت تفصیل سے بتائی تھی۔

قلعے کا کوئی خاص حصہ جو اس وقت مجھے یاد نہیں، دکھاتے دکھاتے پنڈت کیفی چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اس کے بعد کہنے لگے: ”لال قلعے کے وارث آپ ہی تو ہیں۔“

کیفی آنجہانی کے اس جملے سے مجھے یہ خوش فہمی ہوئی کہ میرے مغل ہونے کی بنا پر موصوف ازراہِ مذاق ہی سہی مگر میرا شمار لال قلعے کے وارثوں میں کر رہے ہیں لیکن میرے کسی استفسار سے پہلے ہی اُن کے دوسرے جملے سے صورتِ حال کی وضاحت ہو گئی

کہنے لگے:

"آفتابِ دِلّی کی آخری کرن حیدر آباد ہے۔"

مارچ ۱۹۶۶ء میں جناب ممتاز حسن صاحب نے بھی اسی سلسلے کی ایک بات کہی تھی۔ کراچی میں بہادر یار جنگ اکیڈیمی کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا:

"سلطنتِ مغلیہ کا چراغ دِلّی میں بجھا اور حیدر آباد میں روشن ہوا۔ میں پروفیسر احمد شاہ بخاری کے قول کی پوری پوری تائید کرتا ہوں۔"

پروفیسر بخاری کا واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے ۱۹۵۶ء میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے ایک مشاعرے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"غیر منقسم ہندوستان کے ہر علمی ادارے اور ہر ادیب نے، کسی نہ کسی شکل میں مملکتِ حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ سے فیض حاصل کیا تھا۔"

حیدر آباد کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نے بھی دیا ہے۔

"حیدر آباد عام شہروں کی مانند ایک شہر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا ثقافتی مرکز تھا جو نہ صرف دکن کے بسنے والوں کے لیے بلکہ جملہ مسلمانانِ ہند و پاک کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔"

اور جامعہ عثمانیہ؟ اس مادرِ علمی کے متعلق پروفیسر قاضی محمد حسین، نائب معین امیر جامعہ نے کہا تھا۔

"علم نامانوس زبانوں میں قید تھا۔ سرزمینِ جامعہ عثمانیہ پر آزاد ہوا، عام ہوا۔"

علم کے آزاد اور عام ہونے کی داستان طویل ہے۔ میں صرف ایک واقعہ درج کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اس سے تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کو جامعہ عثمانیہ سے اور فرزندانِ جامعہ کو ڈاکٹر

صاحب سے بے پناہ لگاؤ تھا، چنانچہ فرماتے تھے کہ

"لاہور میں میرا کچھ وقت لوگوں کو یہ سمجھانے میں بھی صرف ہو رہا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات حیدر آباد میں زبان زدِ خاص و عام تھیں۔"

کم علم اور کم سن بچے تک معاشیات، سیاسیات اور دوسرے علوم و فنون کی اصطلاحیں سمجھتے اور بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔ اہلِ پاکستان اگر جامعہ عثمانیہ کی خدمات کو بھول گئے تو سمجھ لو ان کی عقل کو دیمک چاٹ گئی ہے۔ دیمک مارنے کی دوائیں فراہم کرنا تمہارا ہمارا کام ہے۔"

پنڈت کیفی، ممتاز حسن، پروفیسر بخاری، ڈاکٹر محمود حسین خاں، قاضی محمد حسین اور ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے مندرجہ ارشاداتِ گرامی کے بعد حیدر آباد یا جامعہ عثمانیہ کے متعلق میرا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا۔ حیدر آباد جغرافیائی وحدت سے بہت زیادہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ کی طرح ثقافتی اور لسانی وحدت اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ہماری اگلی نسلیں نہ تو لاہور، دہلی اور لکھنو کی عظمت کو فراموش کر سکتی ہیں اور نہ حیدر آباد کی سطوت و شوکت کو، خود ہم بھی انھیں نہیں بھول سکتے۔

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے ۱۹۶۶ء کے انتخابات میں، میرے معتمد منتخب ہونے کے بعد ایک شام میرے پاس فون آیا۔ آواز سے مانوس تھا، سننے لگا۔ "ابھی ایک اخباری رپورٹر نے مجھے ایک منحوس خبر سنائی ہے، وہ کہتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو سے خبروں میں کہا گیا ہے کہ مخدوم......"

آواز بھرا گئی۔ ٹیلی فون خاموش ہوگیا۔ میں بھی سہم گیا۔ چند لمحوں بعد ......"میں بھی دریافت کرتا ہوں ذرا تم بھی جلدی معلوم کرو۔"

کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ خبر کسی اور محی الدین کے متعلق تھی جس کے بعد میں اور سبطِ حسن دیر تک ٹیلی فون پر مخدوم محی الدین، مولوی عبد الحق، قاضی عبد الغفار، ویکا جی

ہوٹل، عزیز کمپنی، حیدر آباد بک ڈپو، جامعہ عثمانیہ اور انفرنو کی باتیں کرتے رہے اور اسی وقت طے ہوا کہ سبطِ حسن ایک مقالہ لکھیں گے اور انجمن کی اس سال کی پہلی ادبی محفل میں پڑھیں گے، چنانچہ انہوں نے لکھا اور جو لکھا، پیشِ خدمت ہے۔ اس کتاب کا نام پہلے "شہرِ آرزو" رکھا تھا۔ بعد میں "شہرِ نگاراں" کر دیا گیا۔ میرا بہت جی چاہا کہ مصنف کا ذکر تفصیل سے کروں مگر اس خیال سے قلم رُک گیا کہ خود سبطِ حسن نے اپنی تصنیف میں جگہ جگہ میرا ذکر کیا ہے البتہ ادبی محفل میں تقریر کرتے ہوئے میں نے ایک واقعہ سُنایا تھا جو یہاں دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حیدر آباد میں چند لڑکیاں لکھنؤ کی باتیں کر رہی تھیں، یہ جاننے کے لیے کہ لکھنو کی وہ کون سی چیز ہے جسے کھائے بغیر اور کون شخصیت ہے جس سے ملے بغیر لکھنو کی سیر مکمل نہیں کہلاتی؟

ایک نے کہا "میں نے تو وہاں لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں کھائی ہیں۔" اس پر دوسری نے پوچھا۔ "کیا لکھنؤ میں تم نے سبطِ حسن کو بھی دیکھا ہے؟"

اس نے جواب دیا "نہیں!" اس پر سب لڑکیاں چیخ اُٹھیں "ہائے اللہ سبطِ حسن کو نہیں دیکھا تو پھر لکھنؤ کیا خاک دیکھا۔"

کچھ ایسی ہی بات سردار جعفری نے بھی کہی ہے:

"...... اور سبطِ حسن سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ، کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح، جو جادو کے محلوں اور بارہ دریوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگاتے ہیں، حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی زبان۔ شاعران کے دوست نہیں، درباری ہیں۔"

شہرِ نگاراں، رنگین یادوں کا مجموعہ اور حسین تاثرات کا خزینہ ہے۔ اس کی ترتیب کا باعث محض وہ عشق ہے جو سبطِ حسن کے دِل میں پہلے بھی تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے

گا۔

شہرِ نگاراں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کا سرِ ورق ملک کے مشہور مصوّر پروفیسر شاکر علی نے بنایا ہے۔ پروفیسر شاکر نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے پرنسپل ہیں۔ مغربی پاکستان میں تدریجی آرٹ کو روشناس کرنے اور مقبول بنانے والوں میں اِن کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ ان کا شمار برِّ صغیر کے چوٹی کے فن کاروں میں ہوتا ہے چنانچہ گزشتہ اگست میں اِن کو صدرِ پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس کا اعزاز بھی مِل چکا ہے۔ شہر نگاراں کے مصنّف کو ان کی دوستی اور دیرینہ رفاقت کا فخر حاصل ہے۔ انجمن بھی پروفیسر شاکر کی بے حد شکر گزار ہے۔

مرزا ظفر الحسن

کراچی۔ اپریل ۱۹۶۷ء

دیباچہ

شہرِ نگاراں کا پہلا ایڈیشن انجمن طلباءِ قدیم جامعہ عثمانیہ، کراچی نے جس کے معتمد میرے عزیز دوست مرزا ظفر الحسن تھے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا مگر چند شاہ پرست افراد کو میری بعض باتیں بہت ناگوار گزری تھیں، یہاں تک کہ حکومت سے کتاب کو ضبط کرنے کا مطالبہ بھی ہوا تھا۔ کتاب ضبط تو خیر کیا ہوتی البتہ جو نسخے انجمن کی تحویل میں تھے وہ داخلِ دفتر کر دیے گئے تھے۔ بس وہی نسخے بچ رہے جو مخالفت شروع ہونے سے پہلے ہی بٹ چکے تھے۔

ہم کو اُن بزرگوں کے ذہنی تضاد پر افسوس ہوتا ہے جو اب تک یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ اسلام ملوکیت پسند ہے یا جمہوریت پسند۔ وہ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ اسلام ملوکیت، شہنشاہیت اور جبر و استبداد کا دشمن ہے مگر دوسری طرف اگر محمود غزنوی یا احمد شاہ ابدالی یا کسی دوسرے زندہ یا مُردہ مسلمان بادشاہ پر نکتہ چینی کی جائے تو ان کی تیوری پر سینکڑوں بل پڑ جاتے ہیں۔ وجہ شاید یہ ہے کہ مسلم معاشرہ تیرہ سو سال سے ملوکیت کا شکار رہا ہے لہٰذا شاہ پرستی ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے

اور اس فرسودہ روایت سے انحراف تہذیبی اقدار سے انحراف تصور کیا جانے لگا ہے حالانکہ ان باتوں کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

بہر حال میرا مقصد کسی کے جذبات کو مجروح کرنا ہر گز نہ تھا لہٰذا کتاب پر نظرِ ثانی کرتے وقت میں نے پوری کوشش کی ہے کہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے کسی کو ذاتی صدمہ نہ پہنچاؤں۔ اس کے باوجود اگر میری کوئی بات کسی کی طبعِ نازک پر گراں گزرے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔

کتاب میں جابجا ترمیموں کے علاوہ کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں، بالخصوص حیدر آباد دکن کے حالیہ سفر کے تاثرات جو میں نے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد کی فرمائش پر لکھے تھے اور اُن کی اجازت سے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ مزید برآں قاضی عبد الغفار کی بعض تصنیفات اور مخدوم محی الدین کی، "بساطِ رقص" پر تبصرے بھی پیشِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ اضافے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

سبطِ حسن

کراچی۔ ۱۸ مئی ۱۹۸۴ء

آں ساغر و آں ساقی

آج میں اس شہرِ نگاراں کا افسانہ سنانے حاضر ہوا ہوں جہاں میرا شعور زندگی کے حسن سے آشنا ہوا اور جہاں میں نے انسانوں سے محبت کرنا سیکھا۔ اس افسانے کا ماحول اور اس کے کردار ایک زمانے میں بڑی زندہ حقیقتیں تھیں لیکن اب حیدر آباد کا وہ پرانا ماحول باقی ہے نہ وہ معاشرہ موجود ہے۔ حالات بدل گئے ہیں، تہذیبی قدروں میں فرق آچکا ہے، نئے نئے سماجی رشتے قائم ہو رہے ہیں اور نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ نبضِ حیات کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ یادوں کے نقوش رفتہ رفتہ دھندلے ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ سرزمینِ دکن کی یادیں اتنی شیریں اور خوش گوار ہیں کہ میں آج بھی ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔ حیدر آباد کو آخری سلام کیے مدت گزری لیکن بلدہ بدستور میری تمناؤں کا مرکز ہے۔ میں آج بھی ایلورہ اور اجنتا کے غاروں میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔

حیدر آباد سے میرا غائبانہ تعارف چھٹی یا ساتویں جماعت میں اُردو ادب کے رشتے سے ہوا۔ اس کے موجب داغؔ اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم تھے۔ ہماری درسی کتاب میں

داغ کا ایک مختصر سا قصیدہ اور مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم شامل تھی۔ داغ نے اپنے قصیدے میں نظام دکن میر محبوب علی خاں کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے اُن کو چند آم بھیجے تھے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ تھا:

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں
بحرِ عطا کیا ہی ہوا موج زن

مولانا ظفر علی خاں کی نظم دریائے موسیٰ کی طغیانی پر ایک اندوہ ناک مرثیہ تھی۔ لکھتے ہیں کہ:

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا
اُلٹا ہے تو نے تختہ یاران و آشنا کا
ہم سے تو یہ وفائیں اور تجھ سے یہ جفائیں
اچھا دیا ہے بدلہ تو نے ہمیں وفا کا

داغ کے قصیدے سے دکنی آموں کا کوئی تصور نہ بندھا البتہ مولانا کی نظم کے باعث ذہن پر موسیٰ ندی کی ہیبت برسوں چھائی رہی۔ لیکن موسیٰ ندی کو دیکھ کر بڑی حیرت اور مایوسی رہی۔ شاید اقبالؔ نے اسی ندی کو دھیان میں رکھ کر کہا تھا کہ

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

اس جوئے کم آب میں نہ لہریں اُٹھتی تھیں نہ کشتیاں چلتی تھیں۔ لیکن بھاگ نگر کی تاریخ گواہ ہے کہ بند باندھے جانے سے پیشتر دریائے موسیٰ بڑا منھ زور دریا تھا۔ برسات کے زمانے میں پہاڑی ندی نالے ابلنے لگتے اور موسیٰ ندی ان باجگزاروں کے بل پر پھولی نہ سماتی اور سیلاب بن کر بہہ نکلتی۔

ہوش سنبھالا تو تاریخِ ہند کے صفحات کو حسن گنگو بہمنی، چاند بی بی اور محمود گاوان کے کارناموں سے روشن اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیوں اور آصف جاہی امرا کی

وطن فروشیوں کے ذکر سے داغ دار پایا اور بڑے ہوئے تو دکن نے اُردو زبان اور شاعری کو فروغ دینے میں جو گراں بہا خدمات انجام دی تھیں ان سے آگاہی ہوئی اور انجمن ترقی اُردو اور دارالترجمہ کی مطبوعات نظر سے گزریں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حیدر آباد دنیا کا واحد خطہ ہے جس کی سرکاری، عدالتی، دفتری، تعلیمی اور تہذیبی زبان اُردو ہے اور جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے تک ہر مضمون اُردو میں پڑھایا جاتا ہے۔

ہمارے زمانے میں علی گڑھ میں حیدر آبادی طلبا کافی تعداد میں تھے لیکن یہ لڑکے عام طور پر یونین کی سرگرمیوں یا طلبا کی تحریکوں سے کتراتے رہتے تھے۔ البتہ استادوں میں ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم اپنی وجاہت، فارسی دانی اور خطابت کی وجہ سے بہت مقبول تھے مگر نیشنلسٹ حلقوں کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ ڈاکٹر صاحب سخت سرکار پرست واقع ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ کے قیام میں، میں کسی ایک حیدر آبادی کو بھی اپنا دوست نہ بنا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد سے کوئی اُنسیت یا جذباتی لگاؤ پیدا نہ ہوا اور نہ مجھے حیدر آباد دیکھنے کا کبھی خیال پیدا ہوا۔

مئی ۱۹۳۵ء کی کوئی تاریخ تھی۔ میں لکھنؤ میں مقیم تھا کہ مولوی عبدالحق صاحب کا تار آیا کہ تم فوراً اورنگ آباد پہنچو۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ اختر حسین رائے پوری کی شرارت ہے کیونکہ وہ اپنے ہر خط میں اورنگ آباد کی ثنا وصفت بیان کرتے تھے لیکن ابھی میں نے پہلے تار کا جواب نہ دیا تھا کہ دوسرا تار ملا۔ اس تار میں مولوی صاحب نے تاکید کی تھی کہ روانگی میں دیر نہ کرو۔ اگر سفرِ خرچ کی ضرورت ہے تو فوراً تار دو۔ میں روپیہ بھیج دوں گا۔ میں نے احباب سے مشورہ کیا اور سب نے یہی کہا کہ چلے جاؤ مولوی صاحب کسی کام ہی سے بلا رہے ہوں گے۔ میں نے بھی سوچا کہ موقع اچھا ہے، اپنے دوست اختر سے مل آئیں گے اور دکن کی بھی سیر ہو جائے گی۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ اس سفر سے میری زندگی کا رُخ ہی بدل جائے گا اور میں وطن کو بھول کر دکن کے گُن گانے لگوں گا۔

میں دکن میں اسی راستے سے داخل ہوا جس راستے سے صدیوں پیشتر پٹھان، ترک، عرب، ایرانی، حبشی اور مغل داخل ہوئے تھے۔ ریل گاڑی جس وقت ریاست حیدر آباد کے حدود میں پہنچی تو صبح کا وقت تھا اور میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس پر سات آٹھ سو سال کی تاریخ کا سایہ پڑ رہا ہے۔ یہ قلعۂ دولت آباد کا پُرشکوہ منظر تھا۔ دکن کا یہ قدیم پاسباں آج بھی سینہ تانے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ اُسی مقام پر سب سے پہلے یادو راجاؤں نے گن اور گیان کے دیے جلائے تھے۔ تب علاؤالدین خلجی نے فتح کا نشان لہرایا تھا اور محمد تغلق کو یہ پُرفضا جگہ اتنی پسند آئی تھی کہ اُس نے دہلی کو اُجاڑ کر دیوگیر کو آباد کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا تھا اور حسن گنگو بہمنی نے سلطان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا اور دکن میں مسلمانوں کی پہلی سلطنت قائم کی گئی اور اورنگ زیب نے اسی دیار میں عورت سے پہلی اور آخری بار محبت کی تھی اور جب آخری جھپکی آئی تو اسی زمین کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

اورنگ آباد پہنچ کر اختر کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی صاحب مجھے حیدر آباد بھیجنا چاہتے ہیں۔ وہاں پیام نامی ایک اخبار قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ مولوی صاحب اس کے سرپرست ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس اخبار میں کام کروں۔

میں اورنگ آباد میں آٹھ دس روز ٹھہرا۔ یہ شہر کسی زمانے میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کی تہذیبوں کا سنگم تھا اور اُردو زبان اور شاعری کی تاریخ میں تو اس کا مقام بہت اُونچا ہے۔ ولیؔ، سراجؔ، قاضی محمود بحریؔ مصنف من لگن، شیخ داؤد ضعیفی اور وجدیؔ وغیرہ اسی چمن کے پھول تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں اورنگ آباد کی اہمیت دہلی سے کم نہ تھی۔ کوہِ وندھیاچل کے جنوب میں علم و ہنر کا سب سے بڑا مرکز اورنگ آباد ہی تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے سو سال بعد تک وہاں کی خاک سے بڑے بڑے صاحب

کمال پیدا ہوتے رہے۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بمبئی اور حیدر آباد کو فروغ ہوا تو اورنگ آباد ویران ہو گیا۔ جن دنوں میں نے اورنگ آباد کو دیکھا تو وہاں ہمیرو کی چند کھنڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہاں کی ادبی زندگی مولوی عبدالحق کے دم سے تھی سو وہ بھی پابہ رکاب تھے کیونکہ انجمن کا صدر دفتر حیدر آباد منتقل ہو رہا تھا۔ اورنگ آباد کالج میں گرمی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اس لیے کالج کے اساتذہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

مولوی صاحب رابعہ دُرانی کے مقبرے سے ملحق ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ انجمن کا صدر دفتر بھی وہیں تھا۔ یہ جگہ آبادی سے دُور پہاڑ کے دامن میں واقع تھی۔ بنگلے کے پچھواڑے آموں کا باغ تھا۔ سامنے کشادہ صحن اور اس کے آگے اُونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ یہ پر فضا اور پُر سکون جگہ مولوی صاحب کو بہت پسند تھی۔ وہ صبح سویرے ان پہاڑیوں پر سیر کرنے جاتے۔ واپس آکر غسل کرتے اور ناشتے سے فارغ ہو کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ یہ کمرہ ان کا کتب خانہ بھی تھا، دفتر بھی اور آرام گاہ بھی۔ ناشتے کی میز پر وہ ہم لوگوں سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے لیکن اس کے بعد کسی کی مجال نہ تھی کہ بن بلائے ان کے کمرے میں داخل ہوتا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب کھانا آتا، تب مولوی صاحب اپنے کمرے سے برآمد ہوتے۔ کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر حقہ پیتے، پھر آرام کرتے۔ چار بجے کے قریب چائے پی جاتی۔ شام کے وقت روضے کے احاطے میں یاروشوں پر ٹہلتے۔ رات کے کھانے کے بعد صحن میں چہل قدمی کرتے اور پھر پڑھتے پڑھتے سو جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے اِن معمولات میں کبھی فرق نہ آیا۔

آخر میری روانگی کا وقت آگیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے مولوی صاحب سے عرض کی کہ یہ میری پہلی ملازمت ہے، وہ بھی اجنبی دیس میں جہاں میں ایک شخص سے بھی واقف نہیں، آپ کچھ رہنمائی فرمائیں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ میاں میں

نصیحت اور رہنمائی کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کسی کی نصیحت سُنی ہے اور نہ کسی کو نصیحت کرتا ہوں، البتہ میرا ایک مشورہ بلکہ تجربہ ہے، شاید تمہارے کام آجائے۔ وہ یہ ہے کہ جس جگہ کام کرو اس طرح کرو کہ جب رخصت ہو تو وہاں تمہاری جگہ پُر نہ ہو سکے۔ اس واقعے کو تیس سال ہو چکے ہیں لیکن مولوی صاحب کی آواز آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے اور ہر نئی ملازمت کے موقعے پر مجھے مولوی صاحب کا یہ مشورہ یاد آجاتا ہے۔ روانگی کے وقت مولوی صاحب نے قاضی صاحب کے نام مجھے ایک خط دیا اور فرمایا کہ میں تمہارے بارے میں قاضی صاحب کو مفصل خط اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ گھبرانا نہیں وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

مجھے اس سے قبل مولوی صاحب ہی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ قاضی صاحب انشا پرداز ہونے کے علاوہ جنگِ آزادی کے آزمودہ کار سپاہی بھی ہیں۔ وہ خلافت ڈیلیگیشن میں حکیم اجمل خان مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ یورپ کا دورہ کر چکے تھے۔ ہمدرد میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے دستِ راست رہ چکے تھے اور ہمدرد کے بند ہونے کے بعد کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں سے اپنا اخبار جاری کیا تھا۔ مولوی صاحب نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ قاضی صاحب بڑے روشن خیال آدمی ہیں اور قاضیوں کی سی سخت گیری اور دل آزاری کی خو اُن میں نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اجنبی دیس اور انجان لوگوں کا خوف دِل سے نکل گیا بلکہ قاضی صاحب سے ملنے اور ان سے صحافت کا فن سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

جن دنوں میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا تو قاضی صاحب کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" نیرنگِ خیال میں قسط وار چھپ رہی تھی۔ ہم لوگ "لیلیٰ کے خطوط" کے مصنف سے واقف نہ تھے لیکن اس کتاب کی قسطیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور قاضی عبدالغفار صاحب کے بارے میں خوب خوب قیاس آرائیاں کرتے تھے۔

عجیب زمانہ تھا وہ بھی۔ لاہور سے "نیرنگِ خیال" اور "ادبی دنیا" شائع ہوتے تھے، دہلی سے "ساقی" اور "جامعہ" نے دھوم مچا رکھی تھی، لکھنو میں "نگار" رجز خواں تھا، گورکھپور سے مجنوں "ایوان" نکالتے تھے، بنارس میں منشی پریم چند کا "ہنس" تھا، الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈیمی کا ترجمان "ہندوستانی" تھا اور اورنگ آباد میں انجمن کا رسالہ "اُردو"۔ ان پرچوں کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی ادبی مسلک، نظریے یا نصب العین کی تبلیغ کو اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ اِن کا کوئی نہ کوئی فلسفۂ حیات تھا جس کی وہ تلقین کرتے تھے، ان کی چند تہذیبی قدریں تھیں جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کا ہر ممتاز رسالہ بجائے خود ایک تحریک تھا۔

اُردو ادب میں یہ عہد منشی پریم چند کے سماجی ناولوں، جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظموں اور نیاز فتح پوری کی انشا پردازیوں کا تھا۔ ان ادیبوں کی تحریروں نے نئی نسل کے عقائد و افکار، جذبات و احساسات میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ یہ لوگ مشاہدۂ حق کی گفتگو نئے انداز سے کرتے تھے اور سماج کے جن ناسوروں پر روایت اور مکر وریا کی ریشمی چادریں پڑی ہوئی تھیں اُن کو عریاں کر کے کہتے تھے کہ دیکھو! یہ ہے تمہارا گھناؤنا معاشرہ اور یہ ہے تمہاری متعفن تہذیب۔

پریم چند دیہاتی زندگی کا نقشہ بڑی سچائی سے کھینچتے تھے۔ ان کی تحریروں میں کسانوں کا سارا دکھ درد یوں کھنچ آتا کہ پڑھنے والے تڑپ اٹھتے تھے۔ نیاز فتح پوری، مولویوں کے اخلاق و کردار کو بے نقاب کرتے تھے اور مذہب کے نام پر جو خونریزیاں ہوئی ہیں، لوٹیں مچی ہیں، ملک تاراج و برباد کیے گئے ہیں ان کو تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ تقلید کی غلامی سے آزاد ہونے کا نعرہ لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک مسلمان سوچنے کی عادت نہ ڈالیں گے اور رشک کرنا نہ سیکھیں گے، ترقی نہیں کر سکتے۔ جوش ملیح آبادی حسن کی تلخ کامیوں کو شراب اور انقلاب کے رنگ میں پیش کرتے تھے اور نوجوانوں کو جہاد

عمل کی دعوت دیتے تھے، البتہ قاضی عبدالغفار نے ایک ایسے طبقے کو اپنے فن کا موضوع بنایا تھا جو سماج کا ٹھکرایا ہوا تھا اور گھروں میں جس کا نام لینا بھی گناہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہوس کی بے شرمیاں اس کوچے کا طواف چھپ چھپ کر کرتی تھیں۔ اُس بازار کے بالاخانوں پر لیلیٰ کے خطوں کے مصنف نے بڑے بڑے زاہدانِ شب زندہ دار کو نفس کی عبادت میں مصروف پایا تھا اور ان کی روداد ِہوس لطف لے لے کر بیان کی تھی۔

ہر دور میں دو طرح کے اہلِ قلم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے قلم کا احترام کرتے ہیں اور جن صداقتوں کو ان کی عقل قبول کرتی ہے یا جن قدروں کو ان کا دل تسلیم کرتا ہے انہیں کا اظہار قلم سے کرتے ہیں، دوسرے وہ اہلِ قلم جو قلم کی تجارت کرتے ہیں۔ سرکار دربار میں جس قسم کا مال درکار ہو، قلم کے زور سے وہی فراہم کرتے ہیں۔ اُس دور میں بھی قلم فروش صاحبانِ قلم کا قحط نہ تھا، البتہ ان کا بازار ذرا مندا تھا کیونکہ ذی شعور لوگ اِنہیں ادیبوں کی عزت کرتے تھے جو عوام کے واردات و تجربات کو اپناتے اور اُن کی آرزوؤں اور حسرتوں، تلخیوں اور تمناؤں کی فنکارانہ انداز میں ترجمانی کرتے تھے۔ منشی پریم چند، نیازؔ فتح پوری، جوشؔ ملیح آبادی اور قاضی عبدالغفار کی مقبولیت کا راز یہی تھا۔

اُسی زمانے میں ایک نئی ادبی تحریک کا غلغلہ اٹھا تھا اور اس زور و شور سے کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی آواز گونج گئی تھی۔ یہ ترقی پسند ادب کی تحریک تھی۔ اس تحریک کا حرفِ آغاز اُردو افسانوں کا ایک مجموعہ تھا جس کا نام ''انگارے'' تھا۔ انگارے کے مصنفین اشتراکی نوجوان تھے جو ولایت سے تعلیم پاکر وطن واپس آئے تھے۔ آج ان کہانیوں کو پڑھ کر آپ ہنسیں گے لیکن اس وقت ان کی وجہ سے اُردو ادب میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ اکثر اخباروں اور رسالوں نے ان پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ لکھنے والوں کو جن میں ایک خاتون بھی تھیں قتل کی دھمکیاں دی گئیں تھیں اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔

مگر نئی نسل نے انگارے اور اس کے لکھنے والوں کو بہت سراہا تھا۔ نوجوان ادیب بھی ان تحریروں سے متاثر تھے چنانچہ اکا دُکا لکھنے والوں نے (جو بعد میں اُردو کے عظیم افسانہ نویس قرار دیے گئے) انگارے کے انداز کی کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ ان کی جرأت اور بے باکی اور معاشرے پر ان کی کڑی تنقیدوں کے چرچے ہونے لگے تھے۔

ہندوستان اُن دنوں ایک عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء کا قانونِ ہند منظور ہو چکا تھا۔ اس قانون میں حکومتِ برطانیہ نے تحریکِ آزادی سے دب کر ملک کو چند رعایتیں دی تھیں۔ سب سے بڑی رعایت صوبائی خود مختاری اور صوبوں کی حد تک پارلیمانی جمہوریت کے قیام کی تھی۔ کانگریس نے ہنوز نئے انتخابات میں شرکت کا فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن قرائن بتاتے تھے کہ گاندھی جی سول نافرمانی اور راست اقدام کے بجائے پارلیمانی جدوجہد کی راہ اختیار کرنے والے ہیں البتہ پنڈت نہرو ان رجحانات کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قانونِ ہند دامِ فرنگ ہے اور ہندوستان کو اس جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ ان کے نزدیک ملک کے دُکھ درد کا مداوا سوشلزم اور فقط سوشلزم میں تھا۔ وہ کچھ دن پہلے یورپ سے اپنی بیوی کملا نہرو کی لاش لے کر لوٹے تھے۔ انہوں نے ہٹلر کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور فاشزم کے مہلک منصوبوں سے واقف تھے۔ وہ سوویت روس، برطانیہ، فرانس اور دوسرے ملکوں کے اشتراکی رہنماؤں، ادیبوں اور دانشوروں سے بھی ملے تھے اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا کی نجات اشتراکیت ہی میں ہے اور دنیا کے امن و تہذیب کو سب سے بڑا خطرہ فاشزم سے ہے جس کو برطانیہ اور فرانس کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ ہندوستان پہنچ کر اُنھوں نے سوشلزم کے حق میں دھواں دھار تقریریں شروع کیں، متعدد رسالے اور مضامین لکھے اور ہندوستانیوں کو للکارا کہ تم کس خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم ابھی تک رام راج کے سپنے دیکھ رہے ہو۔

پنڈت نہرو نئی نسل کے ہیرو تھے چنانچہ نئی نسل کے نوجوان اور کالج کے طلبا ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ خوش قسمتی سے پنڈت جی کو چند نہایت لائق اور مخلص مددگار مل گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف، صاحبزادہ محمود الظفر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا وغیرہ۔ یہ لوگ حال ہی میں ولایت سے تعلیم پاکر لوٹے تھے اور انہوں نے اپنی قابلیت، خطابت اور تحریروں سے جلد ہی نوجوانوں کو اشتراکی تحریک کا گرویدہ کر لیا تھا۔

ہندوستان میں بڑی گہما گہمی، بڑی چہل پہل تھی۔ نیشنلسٹ اور اشتراکی خیال کے لوگ اپنی اپنی تنظیموں کو مقبول اور مستحکم بنانے میں مصروف تھے البتہ مسلمانوں کی کتابِ سیاست کے اوراق ہنوز پریشان تھے۔ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ دونوں مُردہ اور بے عمل جماعتیں تھیں اور مسٹر جناح یہاں کی سیاست سے دِل برداشتہ ہو کر انگلستان چلے گئے تھے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس کے برعکس حیدرآباد میں ہر طرف سکون تھا، خاموشی تھی۔ وہاں نہ طلبا کی کوئی انجمن تھی نہ اشتراکیوں کی کوئی تحریک۔ علما اور مشائخ کی تنظیمیں ضرور تھیں لیکن رُشد وہدایت کا وہ دَور مدت ہوئی گزر چکا تھا جب یہ بزرگ ہم گنہگاروں کی ذہنی تعلیم اور اخلاقی تربیت اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اب تو اُن کا محبوب مشغلہ اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن کے دولت و اقبال کو دعائیں دینا اور اس کے عوض محکمۂ امورِ مذہبی سے وظائف اور انعام حاصل کرنا تھا۔

پیام اور قاضی عبدالغفار

اخبار ''پیام'' کا دفتر نارائن گوڑہ کی ایک کوٹھی میں تھا۔ باہر کے تین کمروں میں دفتر تھا اور اندر قاضی صاحب اور ان کی بیگم رہتی تھیں۔ اسی کوٹھی میں ایک کمرہ مجھے بھی رہنے کو ملا۔ پہلے دن کا تاثر میرے حافظے میں اب تک محفوظ ہے۔ میں نہا دھو کر بیٹھا تھا کہ قاری عباس حسین صاحب منیجر ''پیام'' کمرے میں آئے اور کہنے لگے چلیے قاضی صاحب سے مل لیجیے۔ چنانچہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں برآمدے سے گزرتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کو اسکرین کے ذریعے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ سامنے کے حصے میں تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ قاری صاحب نے مجھے وہاں بٹھایا اور خود یہ کہتے ہوئے اسکرین کے پیچھے چلے گئے کہ قاضی صاحب کو بلا لاؤں۔ تین چار منٹ کے بعد ادھیڑ عمر کا ایک وجیہہ شخص اسکرین کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ یہ قاضی صاحب تھے۔

قاضی صاحب کو میں نے جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، اُونچا قد، چوڑی پیشانی، خشخشی داڑھی، گداز جسم، چہرے پر متانت اور آواز میں خود اعتمادی۔ وہ

تھوڑی دیر تک مجھ سے سفر کے حالات اور مولوی صاحب کی خیریت پوچھتے رہے۔ اندر سے چائے منگوائی، سگریٹ پیش کیا اور جب چائے ختم ہو گئی تو بولے آپ تھکے ہوں گے، جا کر آرام کیجیے۔ شام کے وقت کام کی باتیں ہوں گی۔ شام کے وقت قاضی صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں بلوایا جو اسکرین کے پیچھے تھا اور کہنے لگے میاں معاف کرنا میں دوپہر کو کچھ نہیں کھاتا اس لیے تم لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ پھر میرے صحافتی تجربے کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے تجربے کی عمر تو ایک سال سے بھی کم ہے۔ بس چھ مہینے بمبئی کرانیکل میں سید عبداللہ بریلوی کی شاگردی کی ہے۔ بریلوی صاحب کا نام سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک ان کی لیاقت کی تعریف کرتے رہے اور مجھے مبارکباد دی کہ تمہیں ایسا شفیق استاد ملا۔ میں نے کہا کہ میں استاد ہی کی تلاش میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ آپ نے اگر کچھ سکھا دیا تو پیام کی خدمت کروں گا ورنہ وطن واپس چلا جاؤں گا۔ قاضی صاحب کو میری یہ بات ضرور اچھی لگی ہو گی لیکن وہ اپنے جذبات کا اظہار بہت کم کرتے تھے۔ ہنس کر کہنے لگے اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہم بوڑھوں کو نوجوانوں سے سیکھنا پڑے گا ورنہ کوئی ہمیں دو کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا۔ میں سمجھا قاضی صاحب اخلاقاً اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں مگر وہ سنجیدہ ہو گئے اور دیر تک اُردو صحافت کی پسماندگی اور اخبار نویسوں کی کم علمی کا رونا روتے رہے، پھر مولانا آزاد، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کا ذکر چھڑ گیا، کہنے لگے کہ تمہیں بتاؤ ان کے پائے کا ملک میں کوئی اخبار نویس ہے؟ میں نے عرض کیا اُن بزرگوں کی صحافتی خدمات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں لہٰذا یہ حضرات اگر دوبارہ اخبار نکالیں تو شاید کامیاب نہ ہوں۔ خوش ہو کر بولے، جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو نئی نسل سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میں بتاؤں یہ لوگ کیوں کامیاب نہ ہوں گے؟ اس لیے کہ انہوں نے اپنے دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی ہیں اور تازہ ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہونے کے

باعث ان کے ذہنوں میں جالے لگ گئے ہیں۔ پھر کہنے لگے: "زمیندار" اب بھی نکلتا ہے، مولانا ظفر علی خاں اب بھی اس کے ایڈیٹر ہیں مگر اخبار پڑھ کر کتنی مایوسی ہوتی ہے۔ حصولِ علم کا شوق قاضی صاحب میں مرتے دم تک نہ گیا۔

قاضی صاحب نے مجھے اپنے گھر میں نہیں بلکہ اپنے دل میں جگہ دی اور مجھے اپنی اولاد کی طرح رکھا۔ وہ محبت کا اظہار کرنا بہت معیوب بات سمجھتے تھے، البتہ بیگم صاحب کو تاکید تھی کہ اس لڑکے کا خیال رکھنا اور یہ خیال فقط آرام و آسائش تک محدود نہ تھا بلکہ میرے چال چلن کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ قاضی صاحب کی خاموش شفقت اور آپا کی محبت نے مجھے ایک ہی ہفتے کے اندر اپنا گرویدہ بنالیا۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ چار سال ان کے ہمراہ رہا اور مجھے کبھی پتہ نہ چلا کہ میری تنخواہ کتنی ہے اور میرا ماہانہ خرچ کیا ہے!

قاضی صاحب بڑے وجیہہ اور خوش پوشاک انسان تھے۔ اُن کی شخصیت اتنی باوقار تھی کہ جس محفل میں جاتے نگاہیں اُن کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ عام طور پر صبح شام لباس تبدیل کرتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ، سیاہ رنگ کا پمپ جوتا، ریشمی جرابیں، ریشمی قمیص اور سفید سلک کی شیروانی اُن کی پوشاک تھی۔ جیبی گھڑی لگاتے تھے۔ قراقلی کی کشتی نما ٹوپی اوڑھتے تھے اور نہایت عمدہ قسم کے سگریٹ اور سگار پیتے تھے۔ نفاست اُن کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کے لکھنے کی میز عمدہ قسم کے کاغذوں، رنگ برنگ کے قلم اور پنسلوں سے سجی رہتی تھی۔ میز کی جھاڑ پونچھ وہ خود کرتے تھے اور کسی کو میز کے قریب جانے کی یا میز کی کسی چیز کو چھونے کی اجازت نہ تھی حتیٰ کہ اُن کی بیگم صاحبہ بھی ضرورت کے وقت کاغذ اور پنسل باہر سے منگواتی تھیں۔ قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ میرے کاغذات اِدھر اُدھر ہو جائیں تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اُن کا خط بہت پختہ اور پاکیزہ تھا۔ وہ اخبار کے اداریے اور سر راہے وغیرہ بھی چکنے سفید کاغذ پر لکھتے تھے۔ ایک آدھ بار میں نے ہنسی ہنسی میں کہا بھی کہ آپ کی ان تحریروں کی عمر ایک

دن سے زیادہ نہیں ہوتی پھر آپ اتنا قیمتی کاغذ کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ہنس کر بولے کہ میاں میں کیا کروں، کھردرے کاغذ پر میرا قلم چلتا ہی نہیں اور قلم کو اگر کاغذ سے کشتی لڑنی پڑے تو بے چارہ لکھے گا کیا۔ قاضی صاحب بہت زُود نویس تھے۔ لکھنے بیٹھ جاتے تو طویل سے طویل مضمون ایک ہی نشست میں مکمل کر دیتے تھے اور کیا مجال جو کوئی لفظ یا فقرہ کٹا پٹا ہو۔ بس قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ صفحوں پر نہ کوئی دھبہ ہوتا تھا نہ کوئی لفظ قلم زد کیا جاتا تھا۔

قاضی صاحب بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے تھے اور رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ یہ باتیں شاید ان کا خاندانی ورثہ تھیں جس کو اُن کے احباب نے دو آتشہ کر دیا تھا چنانچہ قاضی صاحب حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی اور سر محمد یعقوب کی فضول خرچیوں کا ذکر بڑے مزے لے کر کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری تو صاحبِ فن تھے۔ انہوں نے لاکھوں کمائے اور ہاتھ کا میل سمجھ کر خرچ کر دیے لیکن مولانا محمد علی اور سر محمد یعقوب کی فضول خرچی کا حال سن کر بڑا افسوس ہوتا تھا۔ ایک دن مولانا محمد علی کا ذکر چھڑا تو بیان کرنے لگے کہ ہمدرد کے زمانے میں بعض اوقات تو ہم لوگوں کو دو دو تین تین مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مولانا کہیں سے دوڑ دھوپ کر کے ہزار دو ہزار روپے لے آتے۔ بس پھر کیا تھا، قطب کی تیاریاں شروع ہو جاتیں اور مولانا دفتر کے سب لوگوں کو ساتھ لے کر پکنک منانے نکل پڑتے۔ وہاں انواع واقسام کے کھانے پکتے اور ساری رقم سیر و تفریح میں پھونک دی جاتی۔

قاضی صاحب اپنی فضول خرچیوں کے ہاتھوں اکثر پریشان رہتے تھے لیکن کیا مجال جو ماتھے پر شکن آجائے یا کسی کو ان کی تنگ دستی کا علم ہو جائے۔ وہ اپنی خوشیوں میں سب کو شریک کرتے تھے لیکن اپنا غم کسی سے بیان نہ کرتے تھے۔ میں تین چار سال اُن کے

ساتھ رہا۔ اُن کی بیگم صاحبہ سے تو پتہ چل جاتا تھا کہ ان دنوں قاضی صاحب کا ہاتھ خالی ہے لیکن خود قاضی صاحب کی زبانی میں نے ایک بار بھی مالی دشواریوں کا تذکرہ نہ سُنا۔ وہ زیادہ پریشان ہوتے تو لکھنے بیٹھ جاتے یا پھر کمرہ بند کر لیتے اور بستر پر لیٹ کر پڑھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

قاضی صاحب کا ذہن مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔ وہ سائنسی انداز میں سوچتے تھے۔ مذہبی توہمات اور سماجی بندھنوں اور فرسودہ رسم و رواج کے سخت مخالف تھے لیکن مشرق کی پرانی تہذیبی اور اخلاقی روایتوں کے بڑے دل دادہ تھے اور اُن کو پوری طرح برتتے تھے۔

قاضی صاحب اپنے مسلک کے اعتبار سے موحد اور انسان دوست تھے اور ان تمام نظریوں کو ناپسند کرتے تھے جن کے کارن انسان الگ الگ فرقوں، مذہبوں اور ملتوں میں بٹ گیا ہے۔ وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، گورے کالے کے فرق کو انسان کی ذہنی ناپختگی سے تعبیر کرتے تھے۔ گنڈہ تعویذ، ٹونے ٹوٹکے، پیری مریدی اُن کے مذہب میں کفر کے برابر تھی۔

مجھے ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ قاضی صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام زہرہ تھا۔ اُن کی شادی اودھ کے ایک چھوٹے سے تعلق دار سے ہوئی تھی جو لکھنؤ یونیورسٹی میں سیاسیات کے اُستاد تھے۔ دوسری لڑکی فاطمہ تھی جس کو سر محمد یعقوب نے (جو فاطمہ کے ماموں تھے) متبنّیٰ کر لیا تھا کیونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ فاطمہ بچپن سے ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ البتہ قاضی صاحب اپنی بڑی بیٹی کو بہت چاہتے تھے۔ اُن کی تصویر ہر وقت اپنی میز پر رکھتے تھے۔

ایک بار زہرہ بی بی اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ لکھنؤ سے آئی ہوئی تھیں اور قاضی صاحب بے حد خوش تھے البتہ انہوں نے مجھے اُن کے شوہر کے سیاسی عقائد سے آگاہ کر

دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان سے سیاسی بحثوں میں نہ اُلجھنا۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ وہ پروفیسر ہونے کے باوجود سخت تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ قاضی صاحب کی نواسی ثریا جو پانچ چھ سال کی تھی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوگئی۔ قاضی صاحب بہت پریشان ہوئے۔ حیدر آباد کے سبھی نامی گرامی ڈاکٹر ایک ایک کر کے بلائے گئے مگر اس زمانے میں ٹائیفائڈ کی دوائیں ایجاد نہ ہوئی تھیں اس لیے ڈاکٹر دوا کے بجائے آرام اور پرہیز پر زور دیتے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کہیں سے آئے تو دیکھا کہ ثریا کے والد صاحب برآمدے میں بیٹھے کوئی چیز پیالے میں گھول رہے ہیں۔ قاضی صاحب سمجھے شاید دوا ہے۔ اُن سے پوچھا تو وہ بولے کہ فلاں مولوی صاحب نے تعویذ دیا ہے اور کہا ہے کہ اسے گھول کر بچی کو پلادو، انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔ قاضی صاحب اُن سے تو کچھ نہ بولے البتہ گھر میں گئے۔ اپنی بیٹی کو بلایا اور کہنے لگے تم لوگ اپنا سامان باندھ لو اور میرے گھر سے فوراً چلے جاؤ۔ وہ بے چاری حیران کہ ابا کو اچانک یہ کیا ہو گیا ہے جو مجھے گھر سے نکال رہے ہیں۔ وہ رونے لگیں تو بیگم صاحبہ دوڑی ہوئی آئیں اور قاضی صاحب پر برسنے لگیں۔ قاضی صاحب نے تعویذ کا قصہ سُنا کر کہا کہ میں اپنے گھر میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ ثریا کو زہر دے کر ہلاک کرے۔ بیگم صاحب نے ٹوکا تو کہنے لگے تم جانتی ہو کاغذ اور سیاہی میں کتنی گندبلا ہوتی ہے۔ ثریا کے باپ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو زہر دے کر ماریں یا گلا گھونٹ کر لیکن ثریا کی لاش اس گھر سے نہیں نکلے گی۔ ثریا کے والد کو جب قاضی صاحب کی خفگی کی خبر ہوئی تو وہ بہت نادم ہوئے، قاضی صاحب سے معافی ہوئی اور تعویذ کا پانی نالی میں بہادیا گیا۔

قاضی صاحب میٹھی چیزوں کے بڑے رسیا تھے۔ کھانے پر اگر کوئی میٹھی چیز نہ ہوتی تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ بیوی یا باورچی پر چیخنے چلانے کی تو عادت نہ تھی لیکن

ڈرائیور کو حکم دیتے کہ جاؤ اور فلاں دکان پر سے مٹھائی لے کر آؤ۔ وہ موٹر لے کر بھاگم بھاگ جاتا اور کھانا ختم ہونے سے پہلے مٹھائی دستر خوان پر موجود ہوتی تھی۔

آم انہیں بے حد پسند تھے۔ چنانچہ چھوٹے بھائی کو جو مراد آباد میں رہتے تھے ہدایت تھی کہ فصل پر ہر ہفتے آموں کا ایک ٹوکرا پارسل کر دیا کریں اور آم بھی ایسے ویسے نہیں بلکہ ثمر بہشت، دسہری اور لنگڑا۔ اس کے علاوہ اُن کے داماد بھی لکھنؤ سے آم بھیجتے رہتے تھے۔ ان آموں کی بڑی نگرانی ہوتی تھی۔ قاضی صاحب دوسرے تیسرے دن ان کی گنتی خود کرتے تھے۔ کھانے کے وقت اگر ہم لوگ اپنے حصے سے زیادہ کھانا چاہتے تو قاضی صاحب جیب سے روپیہ نکال کر کہتے کہ یہ روپیہ لو اور بازار سے جتنے چاہو خرید لاؤ لیکن میرے آموں کو نظر نہ لگاؤ۔

میں ہر سال سردیوں میں جب وطن جاتا تو قاضی صاحب کی فرمائش ہوتی تھی کہ رساول اور قلا قند ضرور لانا۔ ایک بار جب میں واپس آیا تو قاضی صاحب سخت علیل تھے اتنے علیل کہ مجھ کو تار دے کر بلوایا گیا تھا۔ دیکھتے ہی بولے رساول اور قلا قند لائے؟ میں نے کہا جی لایا ہوں لیکن ڈاکٹروں نے تو آپ کو میٹھی چیزیں کھانے کی ممانعت کر دی ہے۔ کہنے لگے: "بکتے ہیں ڈاکٹر، میٹھا کھا کھا کر تو میرا خون بھی میٹھا ہو چکا ہے پھر میٹھے سے پرہیز کیوں کروں۔" ہم لوگوں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور اپنی فرمائش جی بھر کر کھائی۔

آج کل تو صحافت کا شمار بھی کاروبار بلکہ "بڑے کاروبار" میں ہوتا ہے لیکن اب سے نصف صدی پیشتر تک صحافت زر و سیم کا کھیل نہ تھی۔ اُس زمانے میں تو اخباروں کے بے غیرت سے، بے غیرت ایڈیٹروں کو بھی دستِ غیب سے اتنی آمدنی نہ ہوتی تھی کہ وہ عمارتیں کھڑی کر لیتے یا کمپنیوں کے حصے خرید سکتے۔ تعلقاتِ عامہ کے محکمے نہ تھے اور نہ آئے دن بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتی تھیں۔ سفارت خانے بھی نہ تھے جن کے طفیل سال چھ مہینے کے لیے "تعلیمی دورے" کیے جا سکتے تھے۔ اور واپسی میں موٹر، ٹیپ

ریکارڈر، ریفریجریٹر وغیرہ مفت میں لائے جا سکتے تھے۔ غیرت مند اخبار نویسوں کی مالی حالت تو اور بھی زبوں رہتی تھی چنانچہ قاضی صاحب نے تمام عمر اخبار نویسی کی لیکن تمام عمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔

"پیام" کی اشاعت اگرچہ "رہبرِ دکن" سے کم تھی لیکن قاضی صاحب کی شگفتہ تحریروں کی وجہ سے پیام دانشوروں، ادیبوں اور نیشنلسٹ حلقوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ قاضی صاحب کے اداریے دوسرے اخباروں کے خشک اور بے مزہ اداریوں کے برعکس ادبی رنگ لیے ہوتے تھے۔ اُن میں انشا پردازی کا لطف آتا تھا۔ اُن کے طنز و مزاح کے کالم...... سرِ راہے...... کو تو دوست دشمن سبھی بڑے شوق سے پڑھتے رہے۔

قاضی صاحب کی محبوب شخصیتیں تین تھیں۔ اتحادِ اسلام کے مشہور مبلغ سیّد جمال الدین افغانی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ افغانی کے وہ غائبانہ مدّاح تھے البتہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر صاحب اُن کے پُرانے دوست تھے۔ اُن کی تصنیف "آثارِ جمال الدین افغانی" برسوں کی کاوش و تحقیق کا ثمر ہے۔ اس کتاب کا مواد انہوں نے لندن اور پیرس کے کتب خانوں سے جمع کیا تھا۔ اس کو انجمن ترقی اُردو نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ پہلی جلد میں جمال الدین افغانی کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے تھے اور دوسری جلد میں اُن کے بعض اہم مضامین اور دیگر دستاویزوں کا ترجمہ شامل تھا۔ جمال الدین افغانی کی ساری عمر سفر میں گزری۔ وہ آج ہندوستان میں ہیں تو کل ایران یا ترکی، مصر، لندن یا پیرس میں۔ اُن کے آخری ایّام استنبول میں بظاہر شاہی مہمان کے طور پر گزرے لیکن درحقیقت اُن کا انتقال اسیری ہی میں ہوا۔ وہ جب تک زندہ رہے کسی ملک نے اُن کو نہ اپنایا نہ یہ معلوم کرنے کی زحمت کی کہ وہ افغانی تھے یا ایرانی، البتہ اُن کی وفات کے بعد مسلمانوں کی روایتی اسلاف پرستی کی رگ پھڑک اٹھی۔ تب افغانوں نے کہا کہ وہ افغانی تھے اور ایرانیوں نے دعویٰ کیا کہ وہ اسد آباد میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا ایرانی تھے۔

قاضی صاحب کا خیال تھا کہ سیّد صاحب افغانی تھے۔

یہی وہ کتاب تھی جس کی اشاعت کے دوران قاضی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب کے درمیان کسی بات پر اتنی اَن بن ہو گئی کہ مِلنا جلنا بند ہو گیا ورنہ قاضی صاحب دسویں پندرھویں مولوی صاحب کے پاس ضرور جاتے تھے۔ مجھ کو اس رنجش کی سُن گُن اس دن ملی جس دن قاضی صاحب نے دوسری جلد کا مسودہ مجھ کو دیا اور بڑے تلخ لہجے میں کہا کہ جا کر مولوی صاحب کو دے آؤ لیکن رنجش کی وجہ کبھی معلوم نہ ہو سکی۔ دونوں بزرگوں نے کبھی بھولے سے بھی ایک دوسرے کی بدگوئی نہیں کی، نہ مجھ میں اتنی جرأت ہوئی کہ پوچھتا کہ آپ لوگ آپس میں ملتے کیوں نہیں۔

"حیاتِ اجمل خاں" انہوں نے حیدر آباد منتقل ہونے سے پیش تر دلی میں رہ کر مرتب کی تھی لیکن حکیم اجمل خاں کے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خاں سے ناچاقی ہو گئی اور قاضی صاحب مسودہ لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ حیاتِ اجمل خاں اور آثارِ ابوالکلام آزاد قاضی صاحب نے ۱۹۴۷ء کے بعد علی گڑھ سے شائع کیں۔

قاضی صاحب کی انشاپردازی کا ایک دلکش نمونہ اُن کی مختصر سی تصنیف "اُس نے کہا" ہے۔ یہ کتاب انہوں نے حیدر آباد میں لکھی تھی اور خلیل جبران کی کتاب کا چربہ ہے۔ اس میں پیغمبر کے فلسفیانہ اقوال و افکار کو بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "اُس نے کہا" تقسیم سے بہت پہلے لاہور میں چھپی تھی مگر اب نایاب ہے۔ اُن کی ایک اور نایاب تصنیف جو مجھ کو یاد آتی ہے "نقشِ فرنگ" ہے۔ قاضی صاحب فرماتے تھے کہ لندن سے واپسی کے بعد جن دنوں میں بیکار تھا تو ڈاکٹر انصاری کی فرمائش پر میں نے یہ سفرنامہ چند دنوں میں لکھ ڈالا تھا۔

قاضی عبدالغفار کی تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت "لیلیٰ کے خطوط" نے پائی۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے عورتوں پر مردوں کے مظالم کی اور اُن کی ہوس

نائیکوں اور مکاریوں کی داستان ایک طوائف کی زبانی رقم کی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" کے کچھ حصے پہلے "نیرنگِ خیال" میں قسط وار چھپے تھے اور بعد میں لاہور ہی سے ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں کتابی شکل میں معہ تمہید اور اضافہ شائع ہوئے۔

طوائف کا موضوع اُردو ادب میں نیا نہیں ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" سے بہت پہلے منشی سجاد حسین کسمنڈوی کا ناول "نشتر" اور مرزا محمد ہادی رُسوا کا شہرۂ آفاق ناول "اُمراؤ جان ادا" شائع ہو چکے تھے۔ لطف یہ ہے کہ یہ تینوں بزرگ وادیٔ گنگ و جمن کے رہنے والے تھے لیکن تینوں کا گہرا تعلق مدتوں دکن سے رہا۔ منشی سجاد حسین کسمنڈوی (وفات ۱۹۱۲ء) گلبرگہ کے دفترِ مال میں میر منشی تھے۔ "نشتر" انہوں نے وہیں لکھی اور اپنے حاکم اعلیٰ محمد اکرام الدین تعلقہ دار (ڈپٹی کمشنر) گلبرگہ کے نام معنون کی۔ یہ ناول لکھنؤ سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ مرزا رسوا پہلی بار ۱۹۰۱ء میں ملازم ہو کر حیدر آباد گئے۔ پھر ۱۹۱۹ء سے تادمِ مرگ (۱۹۳۱ء) دار الترجمہ سے وابستہ رہے۔ وہ بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اُن کو فلسفہ، انجینئرنگ، ریاضی، کیمسٹری، سب پر پورا عبور حاصل تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اُردو شارٹ ہینڈ کے موجد بھی مرزا رُسوا ہیں۔ قاضی عبدالغفار ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں حیدر آباد گئے اور تیرہ چودہ برس وہاں رہے۔ اگر ۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۸ء کے حادثات پیش نہ آتے تو وہ حیدر آباد کبھی نہ چھوڑتے۔

ان ناولوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ہیروئنیں خاندانی طوائف نہیں بلکہ حالات نے اُن کو کوٹھے پر لا بٹھایا ہے۔ "نشتر" کی ہیروئن خانم جان ایک پٹھان سردار کی یتیم اور بے آسرا بیٹی ہے۔ اُمراؤ جان کو بچپن میں فیض آباد کا ایک بدمعاش زبردستی لے اُڑتا ہے اور لکھنؤ کی ایک ڈیرے دار طوائف کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ لیلیٰ بھی کسی شریف گھر کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے جو محبت کے دھوکے میں آ کر ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے مگر وہ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد دغا دیتا ہے۔

لیکن تینوں کے انجام مختلف ہیں۔ خانم جان بدن کا سودا کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور محمد حسن شاہ سے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہے خفیہ طور پر نکاح کر لیتی ہے۔ دونوں فرار ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ خانم جان غمِ فراق میں بیمار ہو جاتی ہے اور شوہر اُس کو تلاش کرتے کرتے اُس وقت لکھنؤ پہنچتا ہے جب وہ مر چکی ہوتی ہے۔ اُمراؤ جان ادا حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہے اور زندگی بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے گزارتی ہے، البتہ ادھیڑ عمر میں تائب ہو جاتی ہے پھر بھی وہ چکلے کی اتنی خوگر ہو چکی تھی کہ رہتی چوک ہی میں ہے۔ لیلیٰ عرصے تک مردوں سے انتقام کا عزم لیے اپنا جسم فروخت کرتی رہتی ہے اور بالآخر شادی کر لیتی ہے۔

ان ناولوں کے عہد اور معاشرتی ماحول بھی جدا جدا ہیں۔ "نشتر" اُس زمانے کی (۱۷۸۵ء) داستان ہے جب اودھ کی نوابی سلامت تھی البتہ شاہ عالم بادشاہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کے حوالے کر چکے تھے (۱۷۶۵ء) اور کانپور، الٰہ آباد اور مرزا پور میں انگریزوں کی چھاؤنیاں قائم تھیں۔ یہ ناول لکھنوی تہذیب کے بجائے انگریزوں کی طرزِ معاشرت کا دلچسپ مرقع ہے۔ اُس وقت تک انگریزوں میں نسل و رنگ کے تفوق کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اُلٹے ہندوستانی تہذیب کا جادو اُن پر اثر کرتا جا رہا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کی ضیافتوں اور ناچ گانے کی محفلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے، ہندوستانی لباس پہنتے، حقہ پیتے اور پان کھاتے۔ وہ ہندوستانی طائفوں کو جو ایک فوجی چھاؤنی سے دوسری فوجی چھاؤنی کے دورے کرتی رہتی تھیں ملازم رکھ لیتے۔ اپنے بنگلوں پر ان کے مجرے کرواتے اور اُردو فارسی کی غزلیں مزے لے لے کر سنتے۔ جو طوائف ان کو پسند آجاتی اُس کو وہ اپنی داشتہ بنا لیتے بلکہ اِکّا دُکّا نے تو اُن سے شادی بھی رچالی تھی۔ جس وقت خانم جان کی آنکھ کانپور میں منگ صاحب کے منشی محمد حسن شاہ سے لڑی تو خانم کی

مالکہ کا طائفہ منگ صاحب کے بنگلے کے پاس ہی فروکش تھا۔ دس بارہ سال بعد جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہو کر کلکتہ آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جن صاحبانِ والا شان کو "وحشی" ہندوستانیوں کو تہذیب سکھانے بھیجا گیا تھا وہ خود ہندوستانی تہذیب کے دام میں گرفتار ہیں۔ یہ "خطرناک رجحان" کمپنی کے مفاد اور مقاصد کے حق میں نہایت مُضر تھا۔ پس حکم صادر ہوا کہ انگریزوں کو دیسی رعایا سے بالکل الگ تھلگ رہنا چاہیے، اُن کے طور طریقوں کو اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور اپنی نسلی برتری کا رُعب اُن کے دِلوں پر قائم کرنے کی برابر کوشش کرنا چاہیے۔

"اُمراؤ جان ادا" پچاس برس بعد کا قصہ ہے جس میں شامِ اودھ کے اندھیرے اُجالے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ریاست بد نظمیوں، بدامنیوں، لوٹ مار اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہے مگر نوابی طبقہ رنگ رلیوں کے نشے میں مست دولت و ثروت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے۔ اربابِ نشاط کے بالاخانوں پر دِن عید، رات شبِ برات کا سماں ہے۔ اُمراؤ جان ادا اسی ماحول کی پروردہ اور اسی محفل کی آخری شمع ہے۔ مگر مرزا رُسوا کا ناول ایک طوائف کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی عبرت ناک داستان بھی ہے۔ مرزا رُسوا کے ناول "اُمراؤ جان ادا" کا شمار اُردو کے کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اس ناول کی عمر ۸۵ برس سے اوپر ہے مگر ابھی تک اس کے بدن کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مرزا رُسوا نے اس شاہکار میں ۱۹ ویں صدی کے وسط کی شہری زندگی کے ایک پہلو کا نقشہ بڑی سچائی، سادگی اور پرُکاری سے کھینچا ہے۔ لکھنؤ کی بول چال کی میٹھی زبان، چھوٹے چھوٹے فقرے اور واقعہ نگاری اتنی کامیاب اور پُر اثر کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ سچ مچ کی آپ بیتی ہے۔ درحقیقت جو حادثے پیش آئے داستان گو اُن کو نہایت بے تکلفی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے، واقعات کی کڑیاں قدرتی طور پر آپس میں ملتی جاتی ہیں اور کہانی انہیں کے سہارے آگے بڑھتی جاتی

ہے۔یہی صورت کرداروں کی ہے کہ منفرد بھی ہیں اور اپنے طبقے کے نمائندے بھی۔وہ اپنے طرزِ عمل سے، اپنی سج دھج سے، اپنے طور طریقوں سے فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔

مرزا رسوا ناصح یا واعظ نہیں ہیں نہ اُن کے پیشِ نظر معاشرے کی اصلاح ہے۔اُن کو اس سے غرض نہیں کہ طوائفوں کا پیشہ اخلاقی اعتبار سے اچھا ہے یا بُرا۔اُن کے نزدیک ناول نویس کا مقصد حقائق پر سے پردہ اٹھانا ہے۔اُن کی نظر میں طوائفوں کی زندگی کوئی المیہ نہیں جس کا ماتم کیا جائے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس دور کی تہذیب کا انہوں نے تذکرہ کیا اُس میں طوائف کا پیشہ چنداں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس کے برعکس قاضی عبدالغفار کی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" بھرپور معاشرتی تنقید ہے۔وہ "لیلیٰ کے خطوط" کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا، سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا محض حرفِ غلط رہے گا...... لیلیٰ درحقیقت ہمارے جسدِ اجتماعی کا نہ صرف ایک قطرۂ خوں ہے جو میں ان بزرگانِ مِلّت کی خدمت میں نذر لایا ہوں جن کا فرض تھا کہ مصلوں پر تسبیح لے کر بیٹھنے اور منبروں پر بے معنی اور بے نتیجہ وعظ فرمانے کی بجائے اپنی تہذیب کے اس ناسور کے لیے، جس کا ایک قطرۂ خون لیلیٰ ہے کوئی مرہم تجویز کرتے اور اپنی لیڈری کے پلیٹ فارم پر محض تقریریں کر کے اپنے مجرم ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش نہ کرتے۔"

یہ تحریر ۱۹۳۲ء کی ہے لیکن نصف صدی گزر جانے کے باوصف جسم فروشی کے کاروبار میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ اور ترقی ہوئی ہے۔ پہلے مردوں کی ہوس کی تسکین کا

سامان ایک آدھ محلوں تک محدود ہوتا تھا۔ اب شہر کا شاید ہی کوئی محلّہ ہو جہاں "فحاشی" کے اڈّے موجود نہ ہوں۔ بنگلہ دیش اور سوات، دیر وغیرہ سے کھیپ کی کھیپ لڑکیاں لائی جاتی ہیں اور قحبہ خانوں کی بھٹی میں جھونک دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھار پولیس کے چھاپوں کی خبریں بھی چھپ جاتی ہیں اور گرفتاریاں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ کاروبار بدستور جاری رہتا ہے۔ عصمت فروشی کے اڈّوں کو نیست و نابود کرنے کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن عصمت فروشی کے اقتصادی اور سماجی اسباب پر غور نہیں کیا جاتا نہ اُن حالات کو بدلنے کی تدبیریں اختیار کی جاتیں ہیں جو اس سماجی بیماری کا موجب ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" عورت کی جسم فروشی کی داستان نہیں بلکہ ایک فردِ جرم ہے جس کو لیلیٰ پوری نسوانی برادری کی جانب سے انسانیت اور انصاف کی عدالت میں پیش کرتی ہے۔ قاضی صاحب حقوقِ نسواں کے بڑے حامی ہیں۔ اُن کا راسخ عقیدہ ہے کہ عورت کو اگر موقع دیا جائے تو وہ زندگی کے کسی شعبے میں مرد سے پیچھے نہیں رہے گی اور نہ اُس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں مردوں سے کسی صورت کم ہیں مگر مردوں نے اپنی بالادستی کے تحفظ کی غرض سے ایسے ایسے قاعدے قانون وضع کر لیے ہیں کہ عورت لامحالہ مردوں کی دست نگر ہو گئی ہے۔ مرد حاکم ہے، وہ محکوم، مرد آزاد ہے اور وہ غلام، مرد آقا ہے اور وہ اس کی لونڈی، مرد نیک اور پاکباز ہے، عورت بدکار اور عیار۔ لیلیٰ لکھتی ہے کہ:

> "ہماری دنیا میں اعلیٰ دماغ وہ کہلاتے ہیں جو غلام بنانے اور دوسروں کے حقوق پر جابرانہ قبضہ کر لینے کا فن جانتے ہوں۔ سیاست اس کو کہتے ہیں کہ ایک قوم کے وسیع پیٹ میں دوسری اقوام ہضم کی جا سکیں۔ معاشرت اس کو کہتے ہیں کہ ایک دولت مند اور چالاک طبقہ باقی تمام طبقوں پر حکومت کر سکے اور ان کا خون چوس چوس کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہے۔
> ہماری معاشرت میں در حقیقت بنی نوع انسان دو حصوں میں تقسیم ہے۔

برہمن اور اچھوت، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی، ایرانی، عرب، سب اسی تقسیم کے ماتحت ہیں۔ برہمن آقا اور اچھوت غلام! حاکم اور محکوم سرمایہ دار اور غریب، مولانا اور مرید، ان مختلف ناموں کے پردے میں حقیقت ایک ہی ہے جو پوشیدہ ہے! قوی اور ضعیف، بُرا، اچھا، گناہ، ثواب، پاک و ناپاک، بلند و پست، مومن و کافر، حاکم و محکوم، آقا اور غلام، یہ سب اصطلاحیں قوی وضع کرتا ہے اور اسی معیار پر ضعیف جانچے جاتے ہیں۔ اگر آج تم کمزور ہو جاؤ اور میں قوی ہو جاؤں تو تمہارا وجود نا قابلِ معافی جرم اور میری عصمت فروشی ایک پاکیزہ خصلت قرار پائے۔ میں جو کرتی ہوں وہ اعمالِ حسنہ کہے جائیں اور جو کچھ تم کرو وہ گناہ اور جرم سمجھا جائے۔ تمہاری طرف حقارت و نفرت کے وہی اشارے کیے جائیں جو اب میری طرف کیے جاتے ہیں۔ تمہارا کوئی سلام بھی قبول نہ کرے اور جلوسوں میں میری گاڑیاں کھینچی جائیں! مجھ میں تم میں اعمال کا فرق قابلِ توجہ نہیں بلکہ قوی اور ضعیف کا وہ امتیاز ہے جس نے عورت کی گردن مرد کے پاؤں کے نیچے رکھ دی ہے۔ کیا خدا نے جب اس دنیا کو پیدا کیا تھا تو اس نے ہماری زندگی کا یہی نظم قائم کیا جو آج ہے؟ تم چونکہ میرے مقابلے میں قوی ہو اس لیے یہی کہو گے کہ موجودہ تنظیم عین فطرتِ الٰہی ہے۔ میں چونکہ کمزور ہوں، مجھے تمہارا قولِ فیصل ماننا پڑے گا مگر یاد رکھو میرا ایمان یہ نہیں ہے۔ میں قوی کے مقابلے میں ضعیف تو ہوں مگر باغی ہوں۔ تم میری انسانیت کا لباس اتار کر مجھے ننگا کر سکتے ہو، تم میری عصمت پر ڈاکہ ڈال سکتے ہو، تم مجھے اپنے گھر کی ماما اور لونڈی بنا سکتے ہو مگر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو کوئی قوی کسی ضعیف سے نہیں چھین سکتا! فطرتِ الٰہی

کی بھی سب سے بڑی چٹان ہے جو مظلوموں کا سہارا ہے۔ مرد نے اپنی قوت وسیاست سے عورت کی ہستی کو مٹادیا، اس کی پیشانی پر غلامی کا ٹیکہ لگا دیا ہے مگر ابھی تک وہ اس کے ایمان کو نہیں مٹا سکا ہے۔ ہندوستان میں اور اغلباً تمام ایشیا میں ایک دفعہ، عورت مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے جو تمہاری خود ساختہ سوسائٹی کے شیرازے کو درہم برہم کردے گی، ہم تم غالباً اس وقت دُنیا میں زندہ نہ ہو گے جب وہ طوفانِ نوح آئے گا لیکن ہماری آئندہ نسلیں عورتوں کو مردوں کے تختِ شاہی پر قبضہ کرتے دیکھیں گی اور ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیا جائے گا، بلاشبہ جفاکار مردوں کے لیے وہ یوم الحساب بہت سخت ہوگا۔"

قاضی صاحب کی لیلیٰ دورِ حاضر کے علماءِ دین سے بھی بے حد خفا ہے کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ یہ طبقہ عورتوں کو سہارا دینے کے بجائے شریعت کی غلط تعبیریں کرکے عورتوں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ ایک خط کے جواب میں وہ لکھتی ہے کہ

"پچھلے خط میں لکھ چکی ہوں کہ مرد اور عورت کی باہمی محبت حکومت اور قانون اور مذہب سے بالکل آزاد ہے اور اب پھر کہتی ہوں کہ وہ آزاد ہے اور ہمیشہ آزاد رہے گی، مذہب کے تعصبات اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتے! تم کیوں اس بحث میں مذہب کو لے دوڑے؟ مسلمانوں کا مذہب ہزار پانچ سو برس پہلے کچھ ہو تو ہو، اب تو یہ ایک چھتری ہے جس کو مذہب کا نام لینے والے اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دھوپ اور بارش میں یہ چھتری عمامہ وقبا کو خراب ہونے سے بچاتی ہے۔ بازار کے

کتوں کو ڈرانے کے لیے اس سے عصا کا کام لیا جاتا ہے۔ موسم اچھا ہو اور اس کی ضرورت نہ ہو تو وہ گھر کے کسی کونے میں پڑی رہتی ہے۔ ہر شخص کو حق نہیں کہ اسے استعمال کرے، مذہب کے ٹھیکہ دار ہی صرف اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کی شریعت کے مسائل بھی چھتری کی طرح پھیلتے اور بند ہوتے ہیں۔ ضرورت کے وقت شرعی مسائل کی تاویل و توجیہہ بالکل اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح وکلا قانون میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔ جب شریعت کا کوئی حکم حالات اور خواہشات کے خلاف ہو تو اس کو بھلا بھی دیا جاتا ہے اور توڑ مروڑ کر اس کی صورت بھی بگاڑی جا سکتی ہے۔ جب کوئی ذاتی ضرورت پوری کرنی ہو تو کسی نہ کسی کتاب میں کوئی مفید مطلب روایت نکل آتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ ''یوں بھی لکھا ہے۔'' تمہارے جو بڑے ہیں حضرت مولانا، شاہ صاحب، قبلہ مفتی صاحب مدظلہ، ان کے ہاتھ میں شریعت کی رتی ربڑ کی طرح بڑھتی، سکڑتی ہے۔ مُنھ کے جھاگ اور گلے کی پُھولی ہوئی رگوں کے ساتھ جب ''ملعون و مردود'' کی کڑک سے مدرسے اور مسجد کی محرابیں گونجتی ہیں، جب منبر اور مصلے پر بیٹھ کر خدا کی مخلوق کافر اور ملحد بنائی جاتی ہے، جب دنیا کو ''صغیرہ'' اور ''کبیرہ'' کے متعلق احکام سنائے جاتے ہیں، اس وقت ان کو اپنے ''صغیرہ'' اور ''کبیرہ'' کا ذرا خیال نہیں آتا۔ یہ نہیں کہتی کہ سب کی یہی حالت ہے مگر اس تالاب میں بہت سی مچھلیاں گندی ہیں۔ بہت سے صغیرہ اور کبیرہ تو ایسے ہیں کہ مذہب کے لباس میں جواز کی صورت اختیار کر لیتے ہیں مثلاً جو شخص اپنی نفس پرستی کی خاطر تین تین چار چار بیویاں گھر میں رکھے تو کیا وہ اسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا جس گناہ کے تم میرے

گھر آکر مرتکب ہوتے ہو۔

"ہم لوگوں کے دِلوں میں بچپن سے اس طرح مذہب کا خوف..... خوف، محبت نہیں..... پیدا کر دیا جاتا ہے کہ ہماری شخصیت اور قوتِ ارادی بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ ہم اپنی ہر سانس کو مذہب کی ترازو میں تولتے ہیں اور ہر قدم پر ایک دیوتا کو سجدے کرتے ہیں۔ یونہی عمر گزر جاتی ہے۔ زندگی کی فروعات بھی مذہب کے اندر داخل کر لی گئیں تاکہ ہمارے ارادے اور فہم کی گردن میں ایسا پھندا پڑا رہے کہ ہم فرعون کے غلاموں کی طرح عمر بھر پتھر ڈھوتے رہیں اور کوڑوں سے پٹتے رہیں۔ اگر ہم دہنے نتھنے کی بجائے بائیں نتھنے سے سانس لیں تو اس کی سزا ۷۰ ہزار برس تک جہنم کا عذاب ہے، اگر دہنے پاؤں کے بجائے بایاں پاؤں اٹھائیں تو ہمارے لیے ۹۰ ہزار برس دوزخ کی آگ میں جلنا لازمی ہے۔ اگر پانی ناک پکڑ کر نہ پئیں تو عاقبت میں آتشیں تازیانے ہماری کمر پر پڑیں! کروٹ لیں تو اس طرح، ناک صاف کریں تو یوں، لقمہ مُنھ میں رکھیں تو اس طریقے سے اور بستر پر آرام کریں تو اس پہلو، غرض کہ ہر سانس کے ساتھ قانون کی ایک دفعہ موجود ہے..... سزا اور انجام کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان مذہبی عدالتوں میں جہاں پاجاموں کی لمبائی، داڑھیوں کا طول، مونچھوں کا وزن ناپا تولا جاتا ہے۔ انسانی دماغ کا میدانِ عمل ہر طرف محدود ہے اور انسانوں کی شخصیت مفلوج! ہمارا کھانا، پینا، رونا، ہنسنا، سونا، جاگنا، چلنا اور دوڑنا سب مذہب کے اجارہ داروں کی مرضی پر منحصر ہے! ہماری قوتِ امتیازی معطّل ہے۔ مذہب کے اصولوں کو چھوڑ کر، دنیا فروع کی الجھنوں میں پھانس دی گئی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اُصول توڑے جاتے ہیں اور فروع کی پابندی

پر نجات کا انحصار کیا جاتا ہے۔ محبت، اخوت، انسانیت، عصبیت، اس کا تو ذکر نہیں لیکن جھگڑا یہ ہے کہ آمین آہستہ کہی جائے یا زور سے! اسی طرح عورت کی زندگی مرد کے جابرانہ قبضہ میں دے دی گئی۔ واعظ صاحب جب چوکی پر تشریف رکھتے ہیں اور مذہب کے مسائل بیان فرماتے ہیں تو خطابت اور بیان کا سارا زور اس مسئلہ پر صرف ہوتا ہے کہ بیوی کو خاوند کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے لیکن شوہروں کو اپنی بیویوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے اور مردوں پر عورتوں کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا! ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ ہمارے لیے تو دنیا میں صرف ایک مٹھی گیہوں اور آدھ گز کپڑا ہے جو مرد ہم کو عطا کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا قانون بھی وہی بناتا ہے اور مذہب کے قانون کے معنی بھی وہی ہم کو سمجھاتا ہے۔ جو اس کا جی چاہے ہم کو سمجھادے۔ مرد نے پردے کو ہماری عصمت کا محافظ بنایا ہے، گویا عورت اس قدر بداصل ہے کہ اگر پردے کے اندر بند نہ رہے تو اس کی عصمت محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جب کوئی مرد یہ کہتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے پردہ ضروری ہے تو اس کے صاف یہ معنی ہوتے ہیں کہ عورت کی اخلاقی حالت اس کی نگرانی کی محتاج ہے مگر میں کہتی ہوں عورت سے زیادہ مرد کو پردے میں بٹھانے کی ضرورت ہے کہ خود مرد کے گناہوں پر پردہ پڑا رہے۔ جابر حکومتیں اپنے مظلوموں کی آواز بند رکھنے کے لیے نظربندی، زباں بندی اور قید کی ہزاروں صورتیں پیدا کرلیتی ہیں تاکہ مظلوموں کی آواز قید خانے کی دیواروں سے باہر نہ جاسکے۔ مرد کی تمام ذہنی تربیت یہی ہے کہ ہر کام خوف اور دھمکی سے انجام دیا جائے۔ اس کے مذہب کا سب سے

بڑا عنصر خوف ہے اور لالچ، سزا کا خوف اور انجام کی توقع! اچھا کام اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ اچھا ہے بلکہ اس لیے کہ نہ کرنے میں سزا کا اندیشہ ہے اور کرنے میں انعام کی اُمید ہے۔ جس اخلاقِ انسانی کی بنیاد سزا کا خوف ہو وہ ایک کاغذ کی قندیل ہے جس کا کاغذ خوبصورت ہے مگر چراغ روشن نہیں!

"یہ نہ سمجھنا کہ میرے دل میں مذہب کا احترام نہیں مگر میرا تخیل مذہب کے متعلق کچھ اور ہے۔ میرے نزدیک جو کام محض جنت کی اُمید پر کیا جائے وہ محض دھوکہ ہے اور جو جرم محض دوزخ کے ڈر سے نہ کیا جائے وہ فریب ہے۔ گنہگار اگر ستر ہزار برس دوزخ میں جلائے جانے کے ڈر سے گناہ نہ کرے تو بھی اس کی گنہگاری کم نہیں ہوتی، اس کا دل و دماغ بدستور گنہگار رہتا ہے، البتہ دوسرے لوگ اس کے گناہ کی زد سے بچ جاتے ہیں مگر خود اس کے لیے نجات کا کوئی راستہ پیدا نہیں ہوتا۔ نیک کردار اگر محض جنت کے لالچ میں نیکیاں کرے تو اس کی نیکیاں بھی بے قیمت ہیں۔ عمل کتنا ہی نیک ہو، نفس نیک نہیں تو پاکبازی کا دعویٰ غلط ہے۔ مرد کی ذہنیت کا اندازہ اس نکتے سے کر لو کہ اس نے اپنے تخیل میں جو جنت بنائی ہے وہ یکسر ایسی نعمتوں سے بھر دی گئی جو مرد کو مرغوب ہیں۔ عورت کا حقیر وجود بس جنت میں بھی اتنا ہے کہ وہ حور بن کر ساکنانِ فردوس بریں کی خدمت کریں!!

"میں اس بحث کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتی اور نہ تم سے اور تمہارے ہم خیال لوگوں سے اس مسئلے میں اُلجھنا چاہتی ہوں۔ لامذہب میں بھی نہیں ہوں مگر میرا مذہبی تخیل تمہارے تخیل سے کوسوں دُور ہے۔ مذہب کا

تخیل میرے دماغ میں وہ نہیں ہے جو "مولانا" اور "مرشد" تمہیں
سمجھاتے ہیں۔

"ایسی بیوی کے ساتھ جس کمبخت کے یہ خیالات ہوں تمہاری زندگی
کیونکر گزرے گی!"

"لیلیٰ کے خطوط" میں جذبات کی شدت و فراوانی بے شک ہے اور قاضی صاحب نے عورت مرد کے تعلقات کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا اُس کو بڑے خلوص سے رقم کیا ہے لیکن اس کتاب میں نہ کہانی پن ہے نہ واقعہ نگاری۔ کرداروں کی نقاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس میں فقط ایک عورت کے تاثرات بیان کیے گئے ہیں اور ایک ہی بات بار بار دہرائی گئی ہے نتیجہ یہ ہے کہ بات آگے نہیں بڑھتی بلکہ ایک دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔ قاضی صاحب کا اسلوب نہایت دلآویز ہے لیکن اُن کا اندازِ فکر تاریخی نہیں ہے۔ انہوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ایک زمانہ تھا جب دنیا میں ہر جگہ مادری نظام رائج تھا جو بعض اسباب کی بنا پر پدری نظام میں تبدیل ہو گیا۔ وہ اسباب کیا تھے؟ قاضی صاحب کو اس سے بھی غرض نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب حیدر آباد کے حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے تو قاضی صاحب نے "پیام" کو ایک دوست کے حوالے کر دیا اور خود علی گڑھ چلے گئے تاکہ بقیہ عمر انجمن ترقی اُردو کی خدمت میں بسر کر دیں۔ پیام اور حیدر آباد سے رُخصت ہوتے وقت اُن کو جو روحانی صدمہ پہنچا ہو گا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ جس سکون کی تلاش میں قاضی صاحب علی گڑھ گئے تھے وہ انہیں وہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ "خلفائے ادب" نے جلد ہی اُن کے خلاف سازشیں شروع کر دیں حتیٰ کہ جن حضرات کی تحریک پر وہ علی گڑھ گئے تھے انہوں نے بھی اس بوڑھے اور بیمار ادیب سے بے رُخی اختیار کر لی۔ ایک مولانا کی ذات تھی جس نے آخر وقت تک دوستی کا حق ادا کیا مگر وہ بے چارے بھی

کہاں تک چارہ گری کرتے، جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ دوا علاج میں خرچ ہو گئی اور ۵۶ء میں جب قاضی صاحب نے وفات پائی تو اُن کا سارا اثاثہ چند کتابیں اور غیر مطبوعہ دستاویزیں تھیں۔

دکنی تہذیب کی جھلکیاں

اجنبی مقام کے ابتدائی تاثرات بسا اوقات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد کے ابتدائی تاثرات میرے حافظے میں اب تک محفوظ ہیں۔ وہاں مجھے یہ دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ ریل کے ٹکٹ، اسٹیشنوں کے نام، دکانوں کے بورڈ سب اُردو میں ہیں اور ہر شخص اُردو میں گفتگو کرتا ہے۔ البتہ اس بات پر تھوڑی حیرت ہوئی تھی کہ یہ لوگ ابھی تک ۱۸ ویں صدی کی زبان بولتے ہیں لیکن "میں کہا" "جی تقصیر"، "باتاں"، "پاتھاں"، "جی ہو" اور اسی قسم کے الفاظ پہلے ہی دن کانوں میں پڑے تو اُن کی نرمی اور مٹھاس نے بہت لطف دیا اور یوں محسوس ہوا گویا پلک جھپکتے میرؔ اور مصحفیؔ کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔

لوگوں کے حرکات و سکنات بھی مختلف تھے۔ مثلاً انکار کرنا ہو تو ہماری طرف کے لوگ سر کو شانوں کی سمت گھماتے اور اقرار کرنا منظور ہوتا تو سر کو سینے کی طرف جھکاتے ہیں۔ حیدر آباد میں یہ حرکتیں اُلٹی تھیں۔ چنانچہ ایک دن میں کسی کام سے باہر نکلا تو پھاٹک کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا، کیا تم دفتر میں ملازم ہو تو اس نے دائیں

بائیں گردن ہلادی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی لڑکا میرے اور قاری صاحب کے لیے چائے بنا کر لا رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ابھی تو تم کہتے تھے کہ میں یہاں ملازم نہیں ہوں؟ اُس نے پھر دائیں بائیں گردن ہلادی۔ قاری صاحب بھانپ گئے اور لگے قہقہہ مار کر ہنسنے۔ تب پتہ چلا کہ دکن میں اقرار کے وقت دائیں بائیں گردن ہلاتے ہیں۔

ایک دن میں قاضی صاحب سے کچھ پوچھنے اندر جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے دفتر کا چپراسی قاضی صاحب کے دروازے کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں نے پوچھا یہاں کیوں کھڑے ہو تو اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ "چپ" اور وہاں سے کھسک گیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں کام کی جلدی میں تھا۔ چق اُٹھا کر قاضی صاحب کے پاس چلا گیا۔ قاضی صاحب نے شاید ہمارا مکالمہ سن لیا تھا۔ بولے، کس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ کے دفتر کا چپراسی صدیق بہت بدتمیز معلوم ہوتا ہے اور بات دہرادی۔ قاضی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ یہاں کی زبان میں "چپ" کے معنی "یونہی" ہوتے ہیں۔

دکن میں فصلی مہینوں[1] کا رواج بھی میرے لیے نئی چیز تھی۔ فصلی سال شمالی ہندوستان میں بھی رائج تھے۔ لگان اور مالگزاری کی ادائیگی فصلی سال کے مطابق ہوتی تھی۔ آراضیوں کا سارا حساب کتاب فصلی سن میں لکھا جاتا تھا لیکن فصلی مہینوں کے نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُردو کے پرانے قصیدوں میں اگر بہمن، دَے اور اُردی بہشت کا ذکر آجاتا تھا تو سبق پڑھانے والے مولوی صاحب یہ کہہ کر گلو خلاصی کر لیتے تھے کہ یہ ایرانی مہینوں کے نام ہیں۔ فصلی مہینے خواہ دکن کے ایرانی نژاد فرماں رواؤں کی یادگار ہوں یا

۱۔ آذر، دے، بہمن، اسفند، فروردی، اردی بہشت، خورداد، تیر، آمرداد، شہری ور، مہر، آبان (خورداد اور تیر گرمی کے مہینے تھے)

مغلوں نے رائج کیے تھے، میرے لیے غیر معمولی چیز تھے چنانچہ انہیں یاد کرنے میں کافی وقت لگا کیونکہ حافظے کو بہ یک وقت تین متوازی مہینوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ قمری مہینے، انگریزی مہینے اور فصلی مہینے۔ وہاں یہ تینوں سن رائج تھے، البتہ سرکاری کاغذات میں فصلی مہینے ہی لکھے جاتے تھے۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ فصلی مہینے قدیم آریاؤں کی تخلیق ہیں اور پارسیوں کی پرانی کتابوں میں خداوندا ہورمزدا کے اوصاف سے وابستہ ہیں۔

جب میں نے "پیام" میں باقاعدہ کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ حیدرآباد کی خبر رساں ایجنسیاں مقامی خبریں اُردو میں فراہم کرتی ہیں۔ ان ایجنسیوں کو وہ سہولتیں تو نصیب نہ تھیں جو رائٹر اور ایسوسی ایٹیڈ پریس جیسی بین الاقوامی ایجنسیوں کو میسّر تھیں اور نہ ان کا معیار اطمینان بخش تھا لیکن یہ کیا کم تھا کہ انہوں نے اُردو کو اپنا ذریعہ بنایا تھا۔ اگر آپ حضرات کو یہ معلوم ہو جائے کہ پاکستان کے ایک تجربہ کار صحافی تقریباً تین سال سے ایک اُردو نیوز ایجنسی قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہزاروں روپیہ خرچ کر چکے ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل ہے تو آپ کو دکن نیوز ایجنسی اور حیدرآباد نیوز ایجنسی کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان خبر رساں اداروں کے نمائندے ریاست کے ہر بڑے شہر میں موجود تھے اور یہ لوگ اپنی بساط کے مطابق خبریں فراہم کرتے رہتے تھے۔

مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ حیدرآباد مشرقی تہذیب و اقدار کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ وہاں کے لوگوں کا طرزِ معاشرت ہی مشرقی نہ تھا بلکہ ان کا اندازِ فکر اور فلسفہ زیست بھی مشرقی تھا اور وہ لوگ اپنی ان خصوصیات پر شرمندہ نہیں ہوتے تھے بلکہ فخر کرتے تھے۔ یہ اُن کی انفرادیت تھی۔ معاشرے کی اس وحدت کا اظہار مختلف طریقوں پر ہوتا تھا۔ مثلاً نظام دکن ہوں یا اخبار "پیام" کا چپراسی، سب کا لباس ایک تھا۔ وہی سخت باڑھ کی مصری ٹوپی، وہی تنگ مہری کا پاجامہ جس میں ناخنی گوٹ لگی ہوتی تھی، وہی گلبرگہ کے بنے ہوئے سلیم شاہی جوتے، وہی اُونچے کالر کی چست شیروانی جس کا گلا ہمیشہ بند رہتا

تھا کیونکہ گلا کھلا رکھنا خلافِ تہذیب تھا۔ دولت مند اور تنگدست دونوں کا پہناوا یہی تھا البتہ اکثر ہندو شہری ترکی ٹوپی کی جگہ گول یا کشتی نما بال دار ٹوپی اوڑھتے تھے۔ عورتیں ساڑھی باندھتی تھیں لیکن لڑکیاں تنگ مہری کے رنگین پاجامے اور گھٹنے تک لمبے کُرتے پہنتی تھیں۔ اُن کے دوپٹے چھ گز لمبے ہوتے تھے اور اس انداز سے لپیٹے جاتے تھے کہ کمر تک پورا بدن ڈھک جاتا تھا۔ ان رنگ برنگی گڑیوں کو تو اب آنکھیں ترستی ہیں۔

قاضی صاحب کے گھر میں جو کھانا پکتا تھا اس میں مرچ اور کھٹاس برائے نام ہوتی تھی لیکن دو تین ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ مجھے اتفاق سے...... دکنی کھانا کھانے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ مولوی صاحب اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل ہو چکے تھے اور باغِ عامہ کے پاس خیرت آباد میں رہتے تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن شام کے وقت اختر سے ملنے وہاں چلا جاتا تھا۔ ایک روز شام کو پہنچا تو مولوی صاحب باغ میں ٹہل رہے تھے مجھے دیکھ کر بولے، اچھا ہوا، تم آگئے۔ آج رات کو ہم تمہیں نوابی کھانا کھلائیں گے۔ معلوم ہوا کہ ان کے ایک دوست ہیں۔ نواب منظور جنگ۔ یوں تو نواب منظور جنگ کا آبائی وطن لکھنو تھا لیکن دو تین پشتوں سے حیدر آباد میں آباد تھے۔ نظام کے مصاحبِ خاص میں شمار ہوتے تھے اور شہر سے دور ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اختر اور میں مولوی صاحب کے ہمراہ نواب منظور جنگ کی کوٹھی پر پہنچے۔ کھانے کا وقت آیا تو مجھ کو اور اختر کو مولوی صاحب سے دُور جگہ ملی۔ میز انواع واقسام کے کھانوں سے بھری تھی۔ اختر اور میں نواب صاحب کی شان و شوکت اور اجنبی امرا کی موجودگی سے کچھ سہمے ہوئے تھے چنانچہ ہم نے ڈرتے ڈرتے سالن کی جو قاب سامنے رکھی تھی بس اسی میں سے تھوڑا سا شوربہ پلیٹوں میں ڈال لیا مگر ابھی پہلا نوالہ حلق تک نہ پہنچا تھا کہ معلوم ہوا گویا تمام جسم میں پتنگے لگ گئے ہیں۔ بڑی مشکل سے اس لقمے کو نگلا تو ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اب اختر مجھے دیکھے اور میں

اختر کو لیکن وہاں ہماری حالت زار کون پوچھتا۔ آخر ہم لوگوں نے دہی سے پیٹ بھرا مگر مجھے حیدر آباد کے کھٹے اور مرچ کے عادی بننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ شہاب اور ظفر کے گھر پر بگھارے بینگن، کھٹی دال، قیمہ اور کھچڑی فرمائش کر کے پکواتا اور مزے لے لے کر کھاتا تھا۔

ابتدائی دنوں کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ قاضی صاحب کے گھر میں نرسا نام کی ایک بوڑھی دھیڑنی برتن مانجھنے اور جھاڑ پونچھ کرنے آتی تھی۔ دکن کی پست اقوام کا پست ترین طبقہ دھیڑ کہلاتا تھا۔ انہیں صرف مسلمان نوکر رکھتے تھے۔ ایک دن میں اندر بیگم صاحبہ سے باتیں کر رہا تھا کہ صدیق چپراسی آیا اور نرسا سے کہنے لگا کہ چل تجھے چاؤش بلاتا ہے۔ اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی اور برتن مانجھنے میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد صدیق پھر آیا اور نرسا کو ڈانٹنے لگا کہ چلتی کیوں نہیں، چاؤش کھڑا شور مچا رہا ہے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ یہ چاؤش کیا شے ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہاں عربوں کو چاؤش کہتے ہیں۔ یہ لوگ غریبوں کو سود پر روپیہ دیتے ہیں اور پھر اُنہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔

شمالی ہندوستان اور بمبئی میں یہ کاروبار افغان کیا کرتے تھے۔ میں اُن کے ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے نرسا کو پاس بلایا۔ وہ روتی کانپتی آئی اور کہنے لگی کہ تین سال ہوئے میں نے اس آدمی سے پچیس روپے قرض لیے تھے۔ ہر مہینے سود کے چار روپے اُسے دیتی ہوں لیکن اب اُس نے سود چار روپے سے بڑھا کر پانچ روپے کر دیا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ اگر پانچ روپے نہ دے گی تو تیرے پیٹ میں چاقو گھونپ دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ بیگم صاحبہ کے قدموں پر گر پڑی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ میں نے اُسے دِلاسا دیا کہ تو فکر نہ کر میں چاؤش سے بات کرتا ہوں۔ حساب لگایا تو پتہ چلا کہ نرسا اب تک موصوف کو ۱۴۴ روپے فقط سود کے ادا کر چکی ہے اور اصل ۲۵ روپے بدستور باقی ہیں۔

میں باہر نکلا تو دیکھا کہ چاؤش کھڑا ہے۔ وہ لمبا کرتا اور رنگین تہمد پہنے ہوئے تھا۔ کمرے جنبیہ یعنی خنجر لٹک رہا تھا۔ جنبیہ کے دستے پر چاندی کا نہایت باریک کام بنا تھا اور ہاتھ میں ایک عدد تلوار بھی تھی۔ میں نے چاؤش کو لاکھ سمجھایا کہ غریب عورت پر رحم کرو مگر وہ نہ مانا۔ اسلام کا واسطہ دیا اور کہا کہ اسلام میں سود حرام ہے اور سود خوروں کو جہنم کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے لیکن چاؤش پر کوئی اثر نہ ہوا آخر مجبور ہو کر میں نے قانون کی دھمکی دی اور کہا کہ ابھی پولیس کو بلواتا ہوں۔ اس دھمکی سے وہ تھوڑا نرم ہوا تو میں نے تجویز پیش کی کہ تم اصل رقم لے لو اور نرسا کی جان چھوڑ دو لیکن وہ اصل رقم لینے پر راضی نہ تھا بلکہ سود کے پانچ روپیوں پر اصرار کر رہا تھا آخر طے یہ پایا کہ پانچ روپے سود کے اور ۲۵ روپے اصل ادا کر دیے جائیں، چنانچہ اُسے تیس روپے دیے گئے تب نرسا غریب کی جان بچی۔

میں نے دفتر جا کر مردم شماری کا رجسٹر نکالا اور چاؤشوں کے متعلق معلومات جمع کیں تو پتہ چلا کہ یہ لوگ صدیوں پیشتر عرب کے ساحلی علاقوں سے دکن میں وارد ہوئے تھے اور زیادہ تر فوج میں ملازم تھے۔ چنانچہ افواج حیدر آباد کا سپہ سالار جرنل عیدروس عرب ہی تھا۔ وہ دفتروں اور کوٹھیوں میں چوکیداری بھی کرتے تھے۔ سرکاری خزانوں کے محافظ تھے اور سود پر روپیہ بھی چلاتے تھے۔ میں نے ان سود خوروں کے خلاف اسی دن "پیام" میں ایک سخت نوٹ لکھا اور حکومت سے اپیل کی کہ سودی لین دین کے قانون کو سخت کیا جائے تاکہ غریبوں کو چاؤشوں کی دستبرد سے نجات ملے۔

اس اداریے کو شائع ہوئے ابھی چند گھنٹے گزرے ہوں گے کہ چاؤشوں کی انجمن کا ایک وفد تلواروں اور خنجروں سے لیس قاضی صاحب سے ملنے آیا۔ قاضی صاحب کو اداریے کا پس منظر معلوم تھا۔ انہوں نے وفد والوں کو کیا جواب دیا، اس کی تو مجھے خبر نہیں البتہ شام کے وقت میرے دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ یہاں کے بارے میں لکھتے وقت

ذرا مجھ سے مشورہ کر لیا کرو۔

حیدر آباد میں میرا ابھی چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ایک رات کھانے کے بعد قاضی صاحب کہنے لگے کہ شہر میں فلاں صاحب کے گھر پر مشاعرہ ہے۔ جی چاہے تو تم بھی چلو۔ میں اس خیال سے تیار ہو گیا کہ شاید علی گڑھ کا کوئی شناسا مل جائے تو تنہائی دُور ہو۔ ہم لوگ جس وقت مشاعرے میں پہنچے تو شعر خوانی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر کوئی جانی پہچانی شکل نظر نہ آئی۔ البتہ تھوڑی دیر میں صدر مشاعرہ نے مخدوم محی الدین کا نام پکارا تو میں چونک پڑا کیونکہ مخدوم کی دو تین نظمیں میں مجنوں گورکھپوری کے رسالے ایوانؔ میں پڑھ چکا تھا۔ یہ رومانی نظمیں مجازؔ کو بہت پسند تھیں اور ہم دونوں ان نظموں کو اکثر گنگناتے رہتے تھے۔ مخدوم کا نام پکارا گیا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ آبنوسی رنگ کا ایک نہایت وجیہ نوجوان لمبے لمبے سیاہ بال، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، یونانی دیوتاؤں کے سے ترشے ہوئے نقوش، مسکراتا آگے بڑھا۔ ابھی مخدومؔ نے پڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ہر طرف سے فرمائشوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پردہ نشین خواتین میں بھی کھسر پھسر شروع ہو گئی اور چلمنوں کی جنبش سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ پردہ نشینوں کی یلغار دروازوں کی سمت ہے اور اشتیاق کی آنکھیں حجاب کے تکلفات کو ترک کر دینے پر مائل ہیں۔

مخدومؔ کے ترنم میں بلا کی کشش تھی۔ وہ نظم پڑھ چکے تو میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ آپ مجھے مخدوم سے ملا دیں۔ قاضی صاحب مخدومؔ سے واقف تھے۔ انہوں نے مخدوم کو بلا کر مجھ سے ملا دیا اور پہلی ملاقات ہی میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ یہ سب سے بڑی نیکی تھی جو قاضی صاحب نے مجھ سے کی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو مخدومؔ نے مجھے سکندر علی وجدؔ، شاہد صدیقی اور دوسرے کئی ممتاز نوجوان شاعروں سے بھی ملایا۔

مخدوم کی دوستی سے مجھ پر دکنی دلوں کے دروازے کھل گئے۔ مخدوم نے ایک ایک کر کے شہاب، ظفر، اشفاق، جور الہدیٰ، میر حسن، رفیق الدین، صاحبزادہ میکش، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، غرض کہ اپنے سبھی دوستوں سے میری ملاقات کروادی اور رفتہ رفتہ ہمارا حلقۂ احباب اتنا وسیع ہو گیا کہ غریب الوطنی کا احساس تک باقی نہ رہا۔ ان لوگوں کی بدولت میں دکن کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی شریک ہونے لگا اور دکن کی محبت آہستہ آہستہ دل میں گھر کرنے لگی۔

مرزا ظفر الحسن کو پہلے پہل میں نے اداکار کے رُوپ میں دیکھا تھا۔ حیدر آباد کی ایک بزمِ تمثیل جس کا نام انجمن ترقی ڈرامہ تھا، مولوی فضل الرحمان کا ایک مزاحیہ ناٹک "ظاہر باطن" کھیل رہی تھی۔ ظفر نے اس میں لڑکی کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اس ناٹک کی ہیروئن بنے تھے۔ مجھے ان کی اداکاری بہت پسند آئی تھی اور میں نے پیام میں اس پر تبصرہ بھی کیا تھا۔

ایک دن مخدوم آئے اور کہنے لگے کہ چلو تمہیں ظفر سے ملائیں۔ عابد روڈ کے عقبی حصے میں ایک ریڈی ہاسٹل تھا۔ ظفر الحسن اسی سے متصل ایک مکان میں رہتے تھے۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو ظفر موجود نہ تھے۔ البتہ تین چار سال کا ایک لڑکا فرش پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ مخدوم نے اس سے پوچھا "ابے تیرا ماموں کدھر گیا۔" اس نے نہایت بے تکلفی سے مخدوم کو جواب دیا ایک عدد موٹی سی گالی دی۔ میں ہنسنے لگا تو اس نے مجھے بھی ایک نہایت فحش گالی سنادی۔ یہ ظفر کے بھانجے معید تھے۔ ہم لوگ معید کی گالیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ظفر آگئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ معید کو یہ سب گالیاں مخدوم ہی نے سکھا رکھی تھیں اور وہ ہر نووارد کا خیر مقدم انہیں گالیوں سے کرتا تھا۔

ظفر کا گھر چھجو کا چوبارہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے بے روزگار نوجوان، فاقہ مست شاعر اور پریشان حال ادیب وہاں دن رات جمع رہتے تھے اور گپ بازی کیا کرتے تھے۔ میر

حسن، ہم لوگوں کو اقبال کا فلسفہ خودی سمجھاتے۔ مخدوم ولی دکنی کی غزلیں گاتے رہتے
شہاب افلاطون اور ارسطو کے سیاسی نظریات بیان کرتا۔ ظفر کسی ڈرامے کا پلاٹ پڑھ کر
سُناتے، البتہ رفیق الدین جنہیں ہم لوگ صوفی کہتے تھے ہر وقت جذب و محویت کے عالم
میں رہتے اور اگر کبھی ہوش میں آتے تو دُنیا اور دنیا والوں پر برسنے لگتے اور جب کچھ سمجھ
میں نہ آتا تو غسل خانے میں گھس جاتے اور نہانے لگتے تھے۔

مفت کی چائے اور سگریٹ تو خیر یہ لوگ اپنا حق سمجھتے تھے لیکن کھانے کا وقت ہوا
تو کھانے بلکہ رات کو وہیں سو جانے میں بھی کوئی عار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ فرش پر ایک بڑی
سی دری بچھائی جاتی، شیروانیوں کے تکیے بنائے جاتے اور دوسری دری سے رضائی کا کام لیا
جاتا تھا۔ مخدوم نے اس جگہ کا نام ''انفرنو'' رکھا تھا۔ ظفر کی بڑی بہن جو جگت آپا جان
تھیں، ظفر کے دوستوں کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتیں اور ظفر سے زیادہ اُن کی خاطر کرتی
تھیں۔

ظفر سے میری بہت جلد بے تکلفی ہوگئی اور میں ان کے گھر آنے جانے لگا۔
خصوصاً جس روز وطن سے والدہ کا خط آتا تو میں گھر کی یاد بھلانے وہاں ضرور چلا جاتا تھا۔
ظفر کو اداکاری اور ڈرامہ نویسی کے علاوہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا لیکن اخباروں میں
لکھتے ہوئے شرماتے تھے مگر افسوس کہ یہ شرم دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ اُن کا پہلا مضمون
''روسو کا معاشرتی معاہدہ'' پیام میں چھپا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد جب حیدر آباد میں نشرگاہ قائم ہوئی تو ظفر ریڈیو میں ملازم
ہوگئے اور ان کی اداکاری اور ڈرامہ نویسی کے شوق کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ یہ نوکری اُن
کے لیے منفعت بخش تھی یا نہیں، البتہ ان کے احباب کے لیے روزی کا ایک نیا دروازہ بلکہ
پھاٹک کھل گیا۔ ہم لوگوں کا معیارِ زندگی دفعتاً بہت بلند ہوگیا۔ اب چوبارے کے جس
مفت خورے کو دیکھو کافی ہاؤس میں بیٹھا ہے، عزیز ہوٹل میں بیٹھا ہے، ویکاجی میں بیٹھا

ہے۔

حیدر آباد سے چلے جانے کے بعد بھی میرا معمول تھا کہ ہر سال حیدر آباد کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ مرزا ظفرالحسن کو پہلے سے خبر کردی جاتی۔ ان کا جواب آتا کہ مصارف کا "میزانیہ" فوراً بھیجو۔ چنانچہ "میزانیہ" ان کو بھیج دیا جاتا۔ اس میزانیہ میں آمدورفت کا کرایہ، قلی کی مزدوری، چائے اور سگریٹ اور کھانے پینے کا خرچ اور تحفے تحائف کے مصارف، سب ہی شامل ہوتے تھے۔ سب سے بڑی مد "متفرقات" کی ہوتی تھی جو دوسرے تمام مصارف کی مجموعی رقم سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ میرے حیدر آباد وارد ہونے پر چوبارے میں اس میزانیہ پر باقاعدہ مباحثہ ہوتا تھا۔ احباب میزانیہ کی ہر مد میں دس پانچ روپیہ کا اضافہ کردیتے تھے، بالآخر یہ میزانیہ اتفاقِ رائے سے منظور ہوتا اور مرزا ظفرالحسن کے حوالے کردیا جاتا کہ اس پر عمل درآمد کرنے کی واحد ذمہ داری اُن کی تھی۔ چنانچہ ہمارے حیدر آباد پہنچتے ہی ریڈیو اسٹیشن پر ہمارے پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ بعض چیزیں ظفر مجھ سے زبردستی لکھواتے (جس طرح یہ مضمون اُنہوں نے مجھ سے زبردستی لکھوایا ہے) لیکن زیادہ چیزیں جس میں میرا نام نشر کرنے کی ضرورت نہ تھی ظفر کے دفتر والے خود ہی فراہم کرلیتے تھے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں چونکہ میرے تمام اخراجات قاضی صاحب اور دوسرے احباب کے ذمے ہوتے تھے اس لیے میرے چیک ظفر کی تحویل میں رہتے تھے۔ یہ چیک آخری دن بھنائے جاتے کہ مبادا میں انہیں وہیں خرچ کردوں۔

میں نے پہلی بار جامعہ عثمانیہ کی سیر مخدومؔ کے ساتھ کی۔ جامعہ عثمانیہ اہلِ دکن کی اردو نوازی کا نقطۂ عروج ہے۔ اس عظیم شاہکار کی تخلیق و تعمیر پر وہ جتنا فخر کریں کم ہے۔ جامعہ عثمانیہ دنیا کا واحد ادارہ تھا جہاں تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، معاشیات طبیعات، کیمیا، حیوانیات، حتیٰ کہ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی تعلیم بھی اُردو میں ہوتی تھی۔

جامعہ کا اپنا ایک دارالترجمہ و تالیف و تصنیف تھا جو مختلف علوم و فنون کی مستند کتابوں کو دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل کرتا رہتا تھا۔ دارالترجمہ حیدر آباد نے اُردو زبان کے اُفق کو بہت وسیع کیا، اُس کے لغت میں گراں بہا اضافے کیے اور ثابت کر دیا کہ اُردو زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور مشکل سے مشکل خیالات کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔

جامعہ عثمانیہ شہر سے دس گیارہ میل دُور ایک نہایت پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ یہ جگہ سطحِ زمین سے کئی سو فیٹ اُونچی ہے۔ قدرت نے اس خطۂ مرتفع پر جا بجا بڑی بڑی دیو قامت چٹانیں نصب کر دی تھیں۔ ان چٹانوں پر کھڑے ہو کر دیکھو تو حدِ نظر تک کھجور اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ، سیتا پھل اور پپیتوں کے باغ اور دھان کے ہرے ہرے کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کی تعمیر کے منصوبے بننے لگے تو سنا ہے کہ حکومت نے اپنے انجینئروں کو دنیا کے دورے پر بھیجا تاکہ وہ ممتاز یونیورسٹیوں کا بغور معائنہ کریں لیکن انجینئروں نے جامعہ عثمانیہ کا جو نقشہ مُرتب کیا وہ دکن کی تہذیبی روایتوں اور دورِ حاضر کے تعلیمی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ جامعہ کی عمارتیں میرے ہوتے مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ فقط کتب خانہ، طلبا کی تین اقامت گاہیں اور سائنس کے چند شعبے تعمیر پا چکے تھے۔ یہ عمارتیں ایلورہ کے دکنی اور قرطبہ کے اسلامی فنِ تعمیر کا حسین امتزاج تھیں مثلاً ان کے ستون ایلورہ کے نمونے پر تراشے گئے تھے اور محرابیں قرطبہ کے نمونے پر بنی تھیں۔ جامعہ عثمانیہ کی بیرونی شان و شوکت اور اندرونی آرائش و زیبائش کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے الٰہ آباد، لکھنؤ، کلکتہ، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی یونیورسٹیوں کی عمارتیں دیکھی تھیں لیکن یہ عمارتیں جامعہ عثمانیہ کی گرد کو بھی نہ پہنچتی تھیں۔ بورڈنگ ہاؤسوں میں میرے آٹھ دس سال گزرے تھے لیکن ان بورڈنگوں کو جامعہ کی اقامت

گاہوں سے دُور کی نسبت بھی نہ تھی۔ عثمانی طلبا کے کمروں کا قیمتی فرنیچر، کھانے کے ہال، کھیلنے اور پڑھنے کے بڑے کمرے (جن میں جگہ جگہ صوفے بچھے تھے) دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ دراصل مجھے دکنی نوجوانوں کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ میں نے جل کر مخدوم سے کہا کہ تم لوگ یہاں پڑھنے آتے ہو یا نوابی کرنے! ان عیش کوشیوں کی عادت پڑ گئی تو کالج سے نکل کر کیا کرو گے۔ مخدوم نے مسکرا کر جواب دیا: "سرکاری دفتروں میں کلرکی!"

دکنی تہذیب نوابی تہذیب تھی جو برطانوی ہند میں کب کی وفات پا چکی تھی۔ قاعدہ ہے کہ ہر عہد کی تہذیبی قدریں حکمران طبقہ متعین کرتا ہے۔ حیدر آباد میں چونکہ نوابوں اور جاگیرداروں کا راج تھا لہذا دکنی تہذیب کی قدریں بھی نوابی تھیں۔ یہ قدریں دراصل مغلیہ دور کی نشانیاں تھیں۔ دکن کے لوگ نظام اور ان کے خانوادے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شاہی خاندان سے ایک سیڑھی نیچے نواب سالار جنگ، نواب سر آسمان جاہ، نواب وقار الامرا اور نواب خورشید جاہ کی ریاستیں تھیں جو پائگاہ کہلاتی تھیں۔ ان میں سالار جنگ کا مقام سب سے بلند تھا۔ سالار جنگ کو نوادر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس آبائی نوادر بھی بکثرت تھے، چنانچہ ان کا محل اچھا خاصا عجائب گھر تھا اور ان کے کتب خانے میں نئی کتابوں کے علاوہ پرانی اور قلمی کتابوں کے ہزاروں بڑے قیمتی اور نایاب نسخے موجود تھے۔ دکن میں علم و فن کے بڑے قدردان وہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد تھے۔ وہ صوفی منش بزرگ تھے۔ صدرِ اعظمی اُن کو بانیانِ ریاست کے مشہور دیوان چند دلال سے ورثے میں ملی تھی۔ پائگاہوں سے ایک سیڑھی نیچے کوئی سو سوا سو دوسرے نواب راجہ دیس مکھ اور جاگیردار تھے۔ یہ لوگ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور ریاست کے بیشتر اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ درمیانے طبقہ کے لوگ وکالت، دکان داری یا ڈاکٹری کرتے تھے یا کالجوں میں پڑھاتے تھے یا اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔

حیدر آباد ہندوستان کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ریاست کی اپنی

ریلیں چلتی تھیں۔ اضلاع میں بسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سڑکوں پر موٹروں کی ریل پیل رہتی تھی۔ بازار عمدہ سے عمدہ بدیسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا اور جدید طرز کی نہایت خوبصورت کوٹھیاں نفیس ترین سامانوں سے سجی رہتی تھیں لیکن بیشتر مصنوعات باہر سے آتی تھیں، دکن کی پیداوار نہ تھیں۔ دراصل صنعتی عہد وہاں ابھی بالکل ابتدائی دور میں تھا جس کی بنیادی وجہ فرنگی اقتدار تھا۔ زراعت وہاں کی سب سے بڑی صنعت تھی چنانچہ امارت کے سفینے خونِ دہقان ہی میں رواں تھے۔ کاشت کار دولت پیدا کرتے تھے، دوسرے لوگ اس دولت کو بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

تقریباً سات سو سال سے ان علاقوں پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ یہ لوگ عموماً شہروں میں رہتے تھے۔ ملازمت اور زمینداری ان کا پیشہ تھا، البتہ ان کا غریب طبقہ بڑا ہنر مند اور دستکار تھا۔ ملکی مصنوعات اُنہیں کے دم سے زندہ تھیں۔ بیدر کی بنی ہوئی فرشیاں اور بٹن، گلبرگہ کے نرم و نازک جوتے، اورنگ آباد کے ہیمرو اور گلبدن یہی لوگ بناتے تھے۔

یوں تو ان میں سے ہر صنعت اپنی جگہ بے نظیر تھی لیکن مجھے حیدرآباد کی جلد سازی کی صنعت بہت پسند آئی۔ میرا خیال ہے کہ محبوبیہ کارخانہ کی جلد سازی اپنا آپ جواب تھی۔ صناعی کا کمال دیکھیے کہ اس کارخانے کے ہنر مند جہاں پانچ روپیہ ہزار کے حساب سے یعنی ایک دھیلے میں ایک جلد بناتے تھے وہیں پانچ پانچ سو روپے کی جلدیں بھی تیار کرتے تھے جو اپنے طلائی کاموں کے حُسن و نفاست کے باعث پورے ملک میں مشہور تھیں۔

ایک صنعت ایسی تھی جس میں حیدرآباد کو پورے ملک میں اوّلیت اور افضلیت حاصل تھی، وہ تھی سگریٹ کی صنعت۔ وہاں کی چارمینار اور گولکنڈہ سگریٹ کی شہرت دور دور تک تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اتنی عمدہ اور اتنی سستی سگریٹ شاید ہی کہیں بنتی

ہو۔ یہ سگریٹ ایک دکنی صنعت کار کی ایجاد تھی۔ اُس وقت برطانوی ہند میں امپیریل تمباکو کمپنی کی اجارہ داری تھی مگر ایک دکنی صنعت کار کو سگریٹ بنانے کا نسخہ نہ جانے کہاں سے ہاتھ آگیا۔ اُس نے مشینیں منگوائیں اور چارمینار کے نام سے سگریٹ کا کارخانہ قائم کرلیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ سگریٹ دکن میں اتنی مقبول ہوئی کہ خاص و عام سبھی چارمینار پینے لگے۔ امپیریل کمپنی کے مالکوں نے جب دیکھا کہ دکن کا بازار اُن کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے تو انہوں نے چارمینار کے مالک سے کہا تم اپنا کارخانہ ہمارے ہاتھ فروخت کردو، اس نے انکار کیا تو انگریز حکام کے ذریعہ ریاست پر دباوؑ ڈالا گیا۔ رشوتیں بانٹیں گئیں اور بالآخر چارمینار سگریٹ امپیریل کمپنی تمباکو کی ملکیت بن گیا۔ تب دکنی صنعت کار گولکنڈہ سگریٹ کے نام سے ایک نئی سگریٹ بازار میں لایا۔ گولکنڈہ سگریٹ بھی خوب چلی کیونکہ اس میں اور چارمینار میں مہک اور ذائقہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا اور دونوں سگریٹیں ایک آنہ میں بکتی تھیں۔ دکن کا یہ تحفہ شمالی ہند میں بہت پسند کیا جاتا تھا لیکن امپیریل تمباکو کمپنی نے اُس کی برآمد پر پابندیاں لگوادی تھیں تاکہ برطانوی ہند میں اُس کے سگریٹوں کی بکری پر اثر نہ پڑے۔

حیدرآباد کی دوسری صنعتوں میں بدری بٹن، گلبرگہ کے جوتے، کٹاوؑ کے پاندان شامل تھے جن کی نقل تو برطانوی ہند کے کاریگر بھی کرلیتے تھے لیکن کوئی شخص گولکنڈہ اور چارمینار سگریٹ سے ملتی جلتی سگریٹ آج تک نہ بناسکا۔ یہ سگریٹ عوام اور متوسط طبقے میں تو مقبول ہی تھے لیکن اُمرا کے ایوانِ نشاط بھی اُن کے دھوئیں سے مہکتے رہتے ہیں۔

تہذیبی اعتبار سے دکن میں مسلمانوں کے تین گروہ تھے جن کی سوچ ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھی۔ اوّل خالص دکنی تھے جو صدیوں پیشتر مسلمان ہوئے تھے یا اُن کی اتنی پشتیں دکن میں گزر چکی تھیں کہ اب شمالی ہند سے اُن کا کوئی جذباتی

یا خاندانی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ دوسرے وہ خاندان تھے جن کو حیدر آباد میں سکونت اختیار کیے ابھی فقط دو تین پشتیں ہوئی تھیں۔ وہ تلاشِ معاش میں دکن گئے تھے۔ وہاں انہوں نے کوٹھیاں بنوالی تھیں، جائیدادیں خرید لی تھیں اور آرام سے رہتے تھے۔ اُن کی اولاد کا لہجہ، خوراک اور لباس دکنی تھا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو حیدر آبادی کہتے تھے لیکن شمالی ہندوستان سے اُن کا تعلق ابھی باقی تھا۔

تیسرا گروہ خالص غیر ملکیوں کا تھا۔ اُن لوگوں کو دکن یا دکن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

نظم و نسق کے اعتبار سے حیدر آباد دو حصوں میں تقسیم تھا۔ صرفِ خاص اور دیوانی۔ صرفِ خاص دراصل نظام کی ذاتی جاگیر تھی۔ اس کی آمدنی نظام کے ذاتی خزانے میں جاتی تھی۔ صرفِ خاص کے علاقے بے حد پسماندہ تھے۔ دیوانی کا علاقہ صرفِ خاص سے بڑا تھا۔ اس کا نظم و نسق حکومت سرکارِ عالی کے سپرد تھا۔ اختیارات کی تفویض اور تقسیم برطانوی ہند کے مانند تھی یعنی صدرِ اعظم اور اُس کی کابینہ۔ اس کے نیچے معتمدین اور نظما۔ پھر اورنگ آباد، گلبرگہ، رائچور اور ورنگل کے صوبہ دار یعنی کمشنر اور چودہ اضلاع میں ایک ایک تعلق دار یعنی ڈپٹی کمشنر۔ سکندر آباد، بلارم اور ترمل گری برطانوی علاقے تھے۔ وہاں ایک انگریز ریذیڈنٹ مقرر تھا اور اس کی مدد کے لیے گوروں کی ایک فوج وہاں رہتی تھی۔ ریاست حیدر آباد اور برطانیہ کے معاہدات کے مطابق نظام کو مکمل داخلی خود مختاری حاصل تھی مگر افرنگی سیاست نے عملاً نظام کو بے بس کر رکھا تھا۔ حکومت ریذیڈنٹ کی ایما کے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کہنے کو ایک مجلسِ قانون ساز بھی تھی لیکن اُس کی حیثیت خالص مشاورتی تھی اور ارکانِ مجلس سب کے سب نامزد کیے جاتے تھے۔ ریاست کے باشندوں کو انتخاب کا حق نہ تھا اور نہ نظم و نسق میں ان کو کوئی دخل تھا۔ جمہوری آزادی اور شہری حقوق برطانوی ہند کے باشندوں کو

کب حاصل تھے جو دکن کے باشندوں کو ملتے۔ حکومت کی اجازت کے بغیر نہ کوئی جماعت بن سکتی تھی نہ اخبار جاری کیا جا سکتا تھا اور نہ جلسہ ہو سکتا تھا۔

اُس زمانے میں حیدر آباد میں سیاسی سرگرمیاں مفقود تھیں لیکن تہذیبی اور علمی مشاغل پر کوئی پابندی نہ تھی چنانچہ محلے محلے ادبی انجمنیں بنی ہوئی تھیں۔ مشاعرے بڑی پابندی و باقاعدگی سے منعقد کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات علمی اور ادبی مذاکرے بھی ہوتے تھے یا کسی خاص موضوع پر کسی ماہرِ فن کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ ایک صنفِ ادب و فن تو ایسی تھی جس میں دکنی نوجوان منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ وہ تمثیل نگاری کی صنف تھی چنانچہ حیدر آباد میں ڈرامہ لکھنے اور ناٹک کھیلنے والوں کی دو تین انجمنیں قائم تھیں۔ یہ انجمنیں سال میں تین چار ڈرامے ضرور پیش کرتیں۔ یہ ڈرامے عام طور پر معاشرتی یا مزاحیہ ہوتے تھے اور اُن کو دیکھنے کے لیے سارا شہر ٹوٹ پڑتا تھا۔ تمثیلی انجمنوں کا مقصد حصولِ زر نہ تھا بلکہ دانشوروں نے اپنے جمالیاتی شوق کی تسکین اور اظہار کے لیے یہ میدان منتخب کیا تھا۔ مولوی فضل الرحمان، جناب اکبر وفاقانی، سید بادشاہ حسین، مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن حیدر آباد کی تمثیلی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ حضرات خود ناٹک لکھتے، ہدایت کاری کے فرائض انجام دیتے اور بوقتِ ضرورت اداکاری بھی کرتے تھے۔

مجھے مخدوم کا ڈرامہ "پھول بن" خاص طور سے یاد ہے۔ یہ ڈرامہ دراصل چیخوف کے مشہور ڈرامے (CHERRY ORCHARD) کا چربہ تھا۔

CHERRY ORCHARD ایک علامتی اور طنزیہ ڈرامہ تھا جس میں چیخوف نے روس کے جاگیرداری نظام کے زوال اور سرمایہ داری نظام کے آغاز کا نقشہ کھینچا تھا۔ مخدوم نے ماحول اور کرداروں کے نام بدل دیے اور مکالموں میں جا بجا ایسے اشارے رکھ دیے کہ "پھول بن" کا وار حیدر آباد کے جاگیری نظام پر بھرپور پڑا۔

تماشائیوں کو تو پتہ چل گیا کہ روئے سخن کس کی طرف ہے مگر محتسب گرفت نہ کر سکے۔

حیدر آباد کے لوگوں کو اخبار بینی اور کتب بینی کا جنون تھا۔ شہر میں کتابوں کی بہ کثرت دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر لاہور، دہلی، لکھنؤ، بمبئی، غرض ہر جگہ کی مطبوعات آسانی سے دستیاب ہوتی تھیں اور لوگ ان کتابوں اور رسالوں کو بڑے شوق سے خرید کر پڑھتے تھے۔ ایک دکان انگریزی کتابوں کی بھی تھی۔ اس کا نام حیدر آباد بک ڈپو تھا۔ میں اس دکان کو دیکھ کر ششدر رہ گیا کیونکہ تاراپور والا کے علاوہ ایسی شاندار دکان پورے ہندوستان میں نہ تھی۔ یہ دکان تین چار بھائیوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔ ان کا علمی ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ یہ لوگ حیدر آباد کے ایک مشہور گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تعلیم یورپ میں ہوئی تھی۔ ایک بھائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ دوسرے بھائی جامعہ عثمانیہ میں عمرانیات کے اُستاد تھے اور اُردو زبان اور رسم الخط کو آسان بنانے کے تجربے کرتے تھے۔ تیسرے بھائی فرانسیسی زبان کے عالم تھے اور بہت دن تک آربندو گھوش کے آشرم میں پانڈی چری میں رہ چکے تھے۔

اس دکان پر ہر موضوع کی کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ فلسفہ، معاشیات، تاریخ، فنونِ لطیفہ، ادب، ناول غرض یہ دکان انگریزی کی جدید ترین مطبوعات سے پٹی رہتی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ حیدر آباد بک ڈپو میں مارکس، اینگلس، لینن اور دوسرے اشتراکی مصنفوں کی مستند تصانیف اعلانیہ فروخت ہوتی تھیں اور کوئی اعتراض نہ کرتا تھا حالانکہ اس قسم کی کتابیں ہندوستان میں ممنوع تھیں بلکہ ان کا داخلہ بھی بند تھا۔ اس دکان کے مالکوں سے گفتگو کرنے میں بہت مزہ آتا تھا اور ان کے پاس سے آدمی کچھ نہ کچھ سیکھ کر اُٹھتا تھا۔

آج کل کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے لیکن میں اپنے پرانے تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اخبار کے دفتر میں قوم کے دِل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے بشرطیکہ اخبار

نویس سننا چاہے۔ "پیام" کے دفتر کی یہی کیفیت تھی، وہاں بھانت بھانت کے لوگ آتے اور اپنے مسائل ہم سے بیان کرتے تھے۔ جن لوگوں کا مسئلہ ذاتی یا کاروباری ہوتا تھا وہ قاضی صاحب سے ملتے تھے البتہ جن لوگوں کا اخبار سے کوئی کام پڑتا وہ میرے پاس آتے تھے، اُن میں جامعہ عثمانیہ، سٹی کالج یا نظام کالج کے دو چار طلبا ضرور ہوتے تھے۔ کسی کو اپنی غزل یا نظم چھپوانی ہوتی تھی، کوئی مضمون لکھ کر لاتا، کسی کو "پیام" کے اداریے یا خبروں کے بارے میں کچھ کہنا ہوتا بعض یوں ہی سیاسی مسائل پر تبادلہ ٔ خیال کی غرض سے آجاتے تھے۔ غرضیکہ ان نوجوانوں کے ساتھ روزانہ میرے ایک دو گھنٹے گزرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دس بارہ طلبا کا ایک حلقہ بن گیا جو ہمارے خیالات سے متفق تھا۔

اتفاق سے انہیں دنوں طلبائے ہند کے ایک نیم اشتراکی لیڈر جن کا نام ایم ایل شاہ تھا سکندر آباد میں وارد ہوئے۔ بمبئی سے وہ میرے ایک دوست کا تعارفی خط لائے تھے اور چاہتے تھے کہ میں حیدر آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخ قائم کرنے میں اُن کی مدد کروں۔ میں نے انہیں چند طلبا سے ملا دیا۔ انہوں نے مسٹر شاہ سے کہا کہ آپ انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ کے عہدیداروں سے ملیں اور مشورہ کریں۔ چنانچہ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ مخدوم اور میں اُن کو لے کر جامعہ عثمانیہ گئے۔ انجمن اتحاد کے عہدیداروں نے مسٹر شاہ کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا۔ مسٹر شاہ نے اپنی انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور کہا کہ آپ لوگ بھی اسی قسم کی ایک انجمن یہاں بنائیں اور اس کا الحاق ہماری انجمن سے کر لیں۔ حیدر آباد کے لوگ بہت مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مہمان کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ ان کی تجویز کے حق میں بھی نہ تھے اس لیے خاموش ہو گئے مگر ہم لوگ اس خاموشی کے معنی سمجھ گئے۔ ہم نے مسٹر شاہ سے کہا کہ آپ کی یہ تجویز تو بہت مناسب ہے کہ طلبا حیدر آباد کی ایک انجمن ہونی چاہیے تاکہ طلبا کے تعلیمی مسائل حل کیے جا سکیں اور اُن میں اتحاد اور یکجہتی پیدا ہو لیکن اس

انجمن کا الحاق کُل ہند اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ہرگز نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی جماعت کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور آپ کا لائحۂ عمل حیدر آباد کی حد تک بالکل ناقابلِ عمل ہے۔

اس گفتگو کے بعد کھانے کا وقت آیا۔ طلبا نے بیرونی مہمان کے اعزاز میں بڑی پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا تھا لیکن وہاں یہ عالم تھا کہ لڑکے جو چیز مسٹر شاہ کے سامنے پیش کرتے وہ معذرت کر دیتے۔ تب یہ راز کھلا کہ موصوف سبزی خور واقع ہوئے ہیں۔ لڑکوں کو بڑی کوفت ہوئی اور مسٹر شاہ نے تلے ہوئے انڈوں اور آلو سے پیٹ بھرا۔

مسٹر شاہ کے بمبئی واپس چلے جانے کے بعد ہمارے حلقے کے نوجوان طلبا نے جن میں عالم خوند میر اور سری نواس لاہوٹی پیش پیش تھے طلبا کی انجمن بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ آئین و اغراض و مقاصد بڑی احتیاط سے لکھے گئے تاکہ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملے اور انجمن کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔

جس طرح حیدر آباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں اُردو زبان کی پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی اسی طرح اُردو زبان کے قدیم مخطوطات کی تلاش و اشاعت کا سہرا بھی اہلِ دکن کے سر ہے۔ اس کاروانِ شوق کے قافلہ سالار مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ انہوں نے ان مخطوطات کی جستجو اور ترتیب و تدوین میں ایک عمر صرف کر دی۔ پرانے کتب خانوں کی چھان بین کی، خانقاہوں کے طواف کیے، شہروں شہروں مارے مارے پھرے اور جہاں کہیں کسی قدیم نسخے کا سراغ ملا اسے حاصل کیا لیکن ان کہن سال کتابوں کی بہم رسانی سے زیادہ کٹھن کام کرم خوردہ تحریروں کو پڑھنا، سمجھنا، اُن کے متن کو درست کرنا، اُن کی فرہنگ تیار کرنا اور اُن پر حواشی لکھنا تھا مگر مولوی صاحب دُھن کے پکّے تھے چنانچہ اُن کی انتھک کوششوں سے دکن کے ایسے ایسے قدیم شاعروں اور نثر نگاروں کی تحریریں منظرِ عام پر آئیں جن کے نام سے اہلِ علم بھی ناواقف تھے۔ اس تحقیق کے بعد سلطان

قلی قطب شاہ جو اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار پایا اور وجہی، نصرتی اور ابنِ نشاطی وغیرہ کی تحریروں سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شاہ جہاں اور ولی دکنی سے بہت پہلے دکن میں اُردو نثر اور نظم کے بڑے بڑے اہلِ قلم پیدا ہو چکے تھے۔ ان مخطوطات کی اشاعت سے اُردو زبان کی عمر میں تین چار سو برس کا اضافہ ہو گیا۔ لوگوں کے دلوں میں دکن کے تہذیبی ورثے کی اہمیت اور بڑھ گئی اور دکن کے باشعور حلقوں میں اپنے پُرانے شاعروں کے مطالعہ کا اور ان کی یاد تازہ کرنے کا خیال پیدا ہونے لگا۔

یومِ ولؔی اس سلسلے کی پہلی کڑی تھا۔ چنانچہ حیدر آباد میں یہ دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اخباروں اور رسالوں کے ولی نمبر نکلے۔ نشر گاہِ حیدر آباد نے کئی شامیں ولؔی کے کلام کے لیے وقف کر دیں اور مقالے نشر کیے۔ شاعروں نے اپنی نظموں میں ولؔی کو نذرِ عقیدت پیش کی۔ ایک جلسۂ عام نواب سالار جنگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر دکن کے کئی نامور ادیبوں نے ولؔی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مخدوؔم نے اپنی نظم نذرِ ولؔی اسی جلسے میں پڑھی تھی۔ ولؔی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مخدوؔم نے کہا تھا کہ ؎

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولؔی آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے ولؔی آیا
ولؔی وہ ہمدمِ فطرت وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اوّلیں تلمیذِ رحمانی
یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا
دیے روشن کیے مندر میں کعبہ کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں، وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمین پر زندگی کا جام آتا ہے

جشن ولی تو ولی کی وفات کے کئی سو سال بعد منعقد ہوا لیکن حیدر آباد بجا طور ناز کر سکتا ہے کہ میرے گھر میں یومِ اقبال علامہ اقبال کی زندگی ہی میں بڑے اہتمام سے منایا گیا۔

علامہ اقبال کو دکن سے بڑی اُلفت تھی۔ وہ حیدر آباد کو اسلامی ریاست تصور کرتے تھے اور نظام کی بھی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ پہلی بار نظام سے ملے تو انہوں نے نظام کی خدمت میں ایک مختصر سا قصیدہ بھی پیش کیا جس کی جھلکیاں نظر حیدر آبادی کی کتاب ''اقبال اور حیدر آباد (دکن)'' میں بھی ملیں گی۔ قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

اے مقامت برتر از چرخِ بریں
از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
از تو مارا صبحِ خنداں شامِ ہند
آستانت مرکزِ اسلام ہند
بندگاں ہستیم ما، تو خواجہ
از پئے فردائے ما دیباچہ

علامہ اقبال حیدر آباد کی خدمت کے ہمیشہ آرزومند رہے لیکن انہیں کبھی اس کا موقع نہ ملا۔ کئی بار افواہیں اڑیں کہ اقبال حیدر آباد کے چیف جسٹس مقرر ہو گئے ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں لیکن یہ افواہیں کبھی حقیقت نہ بن سکیں اور اقبال یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے کوچ کر گئے۔ حیدر آباد کے لوگوں کو بھی علامہ اقبال کی ذات اور شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ جس زمانے میں میں حیدر آباد میں تھا ان کا دوسرا مجموعہ بالِ جبریل شائع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جتنے نسخے اس کتاب کے وہاں

فروخت ہوئے کسی شہر میں فروخت نہ ہوئے ہوں گے۔

یومِ اقبالؔ کا جلسہ باغِ عام کے بڑے ہال میں ہوا تھا۔ پہلی نشست کی صدارت نواب اعظم جاہ نے کی تھی اور دوسری نشست کی مہاراجہ کشن پرشاد نے۔ مہاراجہ کا انتخاب تو نہایت موزوں تھا کیونکہ وہ علاّمہ اقبال کے دیرینہ دوست اور کرم فرما تھے اور علامہ اقبال حیدر آباد میں ان کے مہمان بھی رہے تھے، یوں بھی مہاراجہ اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے لیکن نواب اعظم جاہ کو شعر و شاعری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نظام کے لڑکوں میں فقط نواب معظم جاہ کرسیِ صدارت پر بیٹھنے کے لائق تھے۔ شاعر ہونے کے علاوہ نواب معظم جاہ کے دربار میں ساری ساری رات شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ جوشؔ، فانیؔ، صدق جائسی، ماہر القادری (جو اس وقت مولانا نہیں ہوئے تھے) اُن کی محفل میں برابر شریک ہوتے تھے۔

یومِ اقبال کے جلسے میں رابندر ناتھ ٹیگور، آغا خان، نواب بھوپال، سر سکندر حیات، نواب رامپور، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ سر اکبر حیدری صدرِ اعظم نے بھی ایک مختصر سی تقریر اقبالؔ کے بارے میں کی تھی لیکن خاص تقریریں ڈاکٹر سید عبداللطیف، نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر محی الدین زورؔ اور مخدومؔ نے کی تھیں۔ اس موقع پر اخباروں نے خاص مضامین اور اداریے بھی شائع کیے تھے۔

حیدر آباد کے ایک مشاعرے کی بدولت مجھے مخدوم کی دوستی نصیب ہوئی تھی، یومِ اقبالؔ کی بدولت مجھے سردار جعفری جیسا عزیز دوست ملا۔ ہوا یوں کہ میرے مضمون کو شمالی ہند کے بعض پرچوں نے نقل کیا۔ اتفاقاً یہ مضمون سردار جعفری کی نظر سے بھی گزرا جو اُن دنوں سیاسی عقائد کے باعث مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکالے جا چکے تھے اور عربک کالج دہلی میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں اقبالؔ پر مضامین کا ایک

مجموعہ مرتب کر رہا ہوں تم اپنا مضمون مجھے بھیج دو۔ میں نے مضمون کی نقل بھیج دی اور اس طرح ہماری خط و کتابت کی ابتدا ہوئی۔

حیدر آباد کی سرزمین طالع آزماؤں کو اکثر راس آتی تھی، جو جاتا تھا فیضیاب ہوتا تھا۔ ملازمت، وظیفہ یا نقد روپیہ، کچھ نہ کچھ ضرور ہاتھ آجاتا تھا لیکن قسمت کی محرومی دیکھیے کہ بعض لوگوں کو دکن کے بحر سخاوت سے شبنم کے چند قطرے ہی ملے۔ اس میں کچھ دخل ان حضرات کی افتادِ طبع کا تھا اور کچھ وہاں کے حالات کا۔ بعض حضرات مثلاً جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری حادثات ہی کا شکار ہوئے۔ ایک بار حفیظ صاحب حیدر آباد تشریف لائے اور قاضی صاحب کے مہمان ہوئے۔ جناب حفیظ جالندھری کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ انہوں نے یونین میں شاہنامہ اسلام کے چند ٹکڑے طلبا کو سنائے تھے اور اب حیدر آباد اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے تاکہ شاہنامے کی بقیہ جلدیں اطمینانِ قلب سے مکمل کی جاسکیں۔ قاضی صاحب اُن کے گہرے دوست تھے چنانچہ قاضی صاحب نے انہیں ہوش بلگرامی سے بھی ملوادیا جو ان دنوں حضور نظام کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے۔ سر کشن پرشاد نے بھی حفیظ کو نوازا تھا مگر حفیظ صاحب میں شاید کوئی باغیانہ رگ ہے جو کبھی کبھار پھڑک اٹھتی ہے۔ حیدر آباد کے قیام میں ایک بار یہ رگ ایسی پھڑکی کہ حفیظ صاحب کو لینے کے دینے پڑگئے۔ ہوا یہ کہ جامعہ عثمانیہ میں بڑا شاندار مشاعرہ تھا۔ مہاراجہ شادؔ صدارت کرنے والے تھے۔ ہم لوگوں نے حفیظ صاحب سے، جو نوجوانوں میں بیٹھ کر بڑی انقلابی باتیں کرتے تھے، کہا کہ آپ اس مشاعرے میں کوئی انقلابی نظم پڑھ دیں تو ہم جانیں۔ حفیظ صاحب نہ جانے کس ذہن میں تھے، حامی بھرلی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ہم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حفیظ صاحب واقعی کوئی ''انقلابی'' نظم لکھیں گے۔ مگر ایک دن دیکھا تو حفیظ صاحب جھومتے جھامتے چلے آرہے ہیں۔ دور سے پکار کر بولے ''بطا نظم

ہوگئی" میں نے کہا سُنائیے..... بولے، ابھی نہیں مشاعرے میں سُننا۔ غرض مشاعرے کا دن آیا قاضی صاحب نے تو جانے سے انکار کر دیا البتہ حفیظ صاحب اور میں قاضی صاحب کی موٹر میں یونیورسٹی پہنچے۔ وہاں مخدوم، ظفر، شہاب سب موجود تھے۔ میں نے ان لوگوں سے ماجرا بیان کیا لیکن کسی کو یقین نہ آیا کہ حفیظ مہاراجہ کے روبرو کوئی انقلابی نظم پڑھنے کی جرأت کریں گے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو بہت رات گئے حفیظ صاحب کی باری آئی۔ سامنے مہاراجہ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے روبرو نیم دائرے کی شکل میں دوسرے وزرا اور عمائدین ریاست دستار اور بگلوس باندھے باادب بیٹھے تھے۔ جب مائکروفون حفیظ صاحب کے سامنے آیا تو انہوں نے ایک لمبا سا کاغذ جیب سے نکالا، چشمے کو صاف کیا اور اپنے مخصوص ترنم سے نظم پڑھنی شروع کی۔ مطلع تھا۔

شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں کھائیں پیئیں آنند رہیں

کالج کے لڑکے حفیظ صاحب کے روایتی کلام سے واقف تھے۔ پہلے تو انہیں یقین نہ آیا لیکن جب حفیظ صاحب نے مطلع کو دہرایا تو سارا ہال واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے گونجنے لگا۔ دو تین شعر کے بعد ہی لڑکے بالکل بے قابو ہو گئے اور لگے اچھل اچھل کر داد دینے۔ اُدھر لڑکوں کا یہ حال اِدھر مہاراجہ کا یہ عالم کہ انہوں نے ایک بار حفیظ صاحب کو غور سے دیکھا پھر جو سر نیوہڑا کر بیٹھے تو آخر تک یونہی گردن نیچی کیے خاموش بیٹھے رہے۔ نائب امیر جامعہ اور یونیورسٹی کے دوسرے عہدے دار دم بخود اور لڑکے تھے کہ ہر شعر پر خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے۔ بارے نظم ختم ہوئی تو مخدوم نے چپکے سے کہا "حفیظ صاحب! والدہ سے دودھ بخشوا کر آئے ہیں نا؟" حفیظ بولے، "یار تم عجیب آدمی ہو۔ خود ہی فرمائش کی کہ انقلابی نظم لکھو اور جب میں نے لکھ دی تو تم مجھے یوں ڈرا رہے ہو۔" حفیظ صاحب کے بعد ظاہر ہے لڑکے کسی اور کا کلام سُننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مہاراجہ نے

ہے۔

حیدر آباد سے چلے جانے کے بعد بھی میرا معمول تھا کہ ہر سال حیدر آباد کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ مرزا ظفر الحسن کو پہلے سے خبر کر دی جاتی۔ ان کا جواب آتا کہ مصارف کا "میزانیہ" فوراً بھیجو۔ چنانچہ "میزانیہ" ان کو بھیج دیا جاتا۔ اس میزانیہ میں آمدورفت کا کرایہ، قلی کی مزدوری، چائے اور سگریٹ اور کھانے پینے کا خرچ اور تحفے تحائف کے مصارف، سب ہی شامل ہوتے تھے۔ سب سے بڑی مد "متفرقات" کی ہوتی تھی جو دوسرے تمام مصارف کی مجموعی رقم سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ میرے حیدر آباد وارد ہونے پر چوبارے میں اس میزانیہ پر باقاعدہ مباحثہ ہوتا تھا۔ احباب میزانیہ کی ہر مد میں دس پانچ روپیہ کا اضافہ کر دیتے تھے، بالآخر یہ میزانیہ اتفاقِ رائے سے منظور ہوتا اور مرزا ظفر الحسن کے حوالے کر دیا جاتا کہ اس پر عمل درآمد کرنے کی واحد ذمہ داری اُن کی تھی۔ چنانچہ ہمارے حیدر آباد پہنچتے ہی ریڈیو اسٹیشن پر ہمارے پروگراموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بعض چیزیں ظفر مجھ سے زبردستی لکھواتے (جس طرح یہ مضمون اُنہوں نے مجھ سے زبردستی لکھوایا ہے) لیکن زیادہ چیزیں جس میں میرا نام نشر کرنے کی ضرورت نہ تھی ظفر کے دفتر والے خود ہی فراہم کر لیتے تھے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں چونکہ میرے تمام اخراجات قاضی صاحب اور دوسرے احباب کے ذمے ہوتے تھے اس لیے میرے چیک ظفر کی تحویل میں رہتے تھے۔ یہ چیک آخری دن بھنائے جاتے کہ مبادا میں انہیں وہیں خرچ کر دوں۔

میں نے پہلی بار جامعہ عثمانیہ کی سیر مخدومؔ کے ساتھ کی۔ جامعہ عثمانیہ اہلِ دکن کی اُردو نوازی کا نقطۂ عروج ہے۔ اس عظیم شاہکار کی تخلیق و تعمیر پر وہ جتنا فخر کریں کم ہے۔ جامعہ عثمانیہ دنیا کا واحد ادارہ تھا جہاں تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، معاشیات طبیعات، کیمیا، حیوانیات، حتیٰ کہ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی تعلیم بھی اُردو میں ہوتی تھی۔

جامعہ کا اپنا ایک دارالترجمہ و تالیف و تصنیف تھا جو مختلف علوم و فنون کی مستند کتابوں کو دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل کرتا رہتا تھا۔ دارالترجمہ حیدر آباد نے اُردو زبان کے اُفق کو بہت وسیع کیا، اُس کے لغت میں گراں بہا اضافے کیے اور ثابت کر دیا کہ اُردو زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور مشکل سے مشکل خیالات کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔

جامعہ عثمانیہ شہر سے دس گیارہ میل دُور ایک نہایت پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ یہ جگہ سطحِ زمین سے کئی سو فیٹ اُونچی ہے۔ قدرت نے اس خطۂ مرتفع پر جا بجا بڑی بڑی دیو قامت چٹانیں نصب کر دی تھیں۔ ان چٹانوں پر کھڑے ہو کر دیکھو تو حدِ نظر تک کھجور اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ، سیتا پھل اور پپیتوں کے باغ اور دھان کے ہرے ہرے کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کی تعمیر کے منصوبے بننے لگے تو سنا ہے کہ حکومت نے اپنے انجینئروں کو دنیا کے دورے پر بھیجا تاکہ وہ ممتاز یونیورسٹیوں کا بغور معائنہ کریں لیکن انجینئروں نے جامعہ عثمانیہ کا جو نقشہ مُرتب کیا وہ دکن کی تہذیبی روایتوں اور دورِ حاضر کے تعلیمی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ جامعہ کی عمارتیں میرے ہوتے مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ فقط کتب خانہ، طلبا کی تین اقامت گاہیں اور سائنس کے چند شعبے تعمیر پا چکے تھے۔ یہ عمارتیں ایلورہ کے دکنی اور قرطبہ کے اسلامی فنِ تعمیر کا حسین امتزاج تھیں مثلاً ان کے ستون ایلورہ کے نمونے پر تراشے گئے تھے اور محرابیں قرطبہ کے نمونے پر بنی تھیں۔ جامعہ عثمانیہ کی بیرونی شان و شوکت اور اندرونی آرائش و زیبائش کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے الٰہ آباد، لکھنؤ، کلکتہ، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی یونیورسٹیوں کی عمارتیں دیکھی تھیں لیکن یہ عمارتیں جامعہ عثمانیہ کی گرد کو بھی نہ پہنچتی تھیں۔ بورڈنگ ہاؤسوں میں میرے آٹھ دس سال گزرے تھے لیکن ان بورڈنگوں کو جامعہ کی اقامت

گاہوں سے دُور کی نسبت بھی نہ تھی۔ عثمانی طلبا کے کمروں کا قیمتی فرنیچر، کھانے کے ہال، کھیلنے اور پڑھنے کے بڑے کمرے (جن میں جگہ جگہ صوفے بچھے تھے) دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ دراصل مجھے دکنی نوجوانوں کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ میں نے جل کر مخدوم سے کہا کہ تم لوگ یہاں پڑھنے آتے ہو یا نوابی کرنے! ان عیش کوشیوں کی عادت پڑ گئی تو کالج سے نکل کر کیا کرو گے۔ مخدوم نے مسکرا کر جواب دیا: ''سرکاری دفتروں میں کلرکی!''

دکنی تہذیب نوابی تہذیب تھی جو برطانوی ہند میں کب کی وفات پا چکی تھی۔ قاعدہ ہے کہ ہر عہد کی تہذیبی قدریں حکمران طبقہ متعین کرتا ہے۔ حیدر آباد میں چونکہ نوابوں اور جاگیرداروں کا راج تھا لہٰذا دکنی تہذیب کی قدریں بھی نوابی تھیں۔ یہ قدریں دراصل مغلیہ دور کی نشانیاں تھیں۔ دکن کے لوگ نظام اور ان کے خانوادے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شاہی خاندان سے ایک سیڑھی نیچے نواب سالار جنگ، نواب سر آسمان جاہ، نواب وقار الامرا اور نواب خورشید جاہ کی ریاستیں تھیں جو پائگاہ کہلاتی تھیں۔ ان میں سالار جنگ کا مقام سب سے بلند تھا۔ سالار جنگ کو نوادر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس آبائی نوادر بھی بکثرت تھے، چنانچہ ان کا محل اچھا خاصا عجائب گھر تھا اور ان کے کتب خانے میں نئی کتابوں کے علاوہ پرانی اور قلمی کتابوں کے ہزاروں بڑے قیمتی اور نایاب نسخے موجود تھے۔ دکن میں علم و فن کے بڑے قدردان وہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد تھے۔ وہ صوفی منش بزرگ تھے۔ صدرِ اعظمی اُن کو بانیانِ ریاست کے مشہور دیوان چند ولال سے ورثے میں ملی تھی۔ پائگاہوں سے ایک سیڑھی نیچے کوئی سو سوا سو دوسرے نواب راجہ دیس مکھ اور جاگیردار تھے۔ یہ لوگ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور ریاست کے بیشتر اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ درمیانے طبقہ کے لوگ وکالت، دکان داری یا ڈاکٹری کرتے تھے یا کالجوں میں پڑھاتے تھے یا اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔

حیدر آباد ہندوستان کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ریاست کی اپنی

ریلیں چلتی تھیں۔ اضلاع میں بسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سڑکوں پر موٹروں کی ریل پیل رہتی تھی۔ بازار عمدہ سے عمدہ بدیسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا اور جدید طرز کی نہایت خوبصورت کوٹھیاں نفیس ترین سامانوں سے سجی رہتی تھیں لیکن بیشتر مصنوعات باہر سے آتی تھیں، دکن کی پیداوار نہ تھیں۔ دراصل صنعتی عہد وہاں ابھی بالکل ابتدائی دور میں تھا جس کی بنیادی وجہ فرنگی اقتدار تھا۔ زراعت وہاں کی سب سے بڑی صنعت تھی چنانچہ امارت کے سفینے خونِ دہقان ہی میں رواں تھے۔ کاشت کار دولت پیدا کرتے تھے، دوسرے لوگ اس دولت کو بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

تقریباً سات سو سال سے ان علاقوں پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ یہ لوگ عموماً شہروں میں رہتے تھے۔ ملازمت اور زمینداری ان کا پیشہ تھا، البتہ ان کا غریب طبقہ بڑا ہنر مند اور دستکار تھا۔ ملکی مصنوعات اُنہیں کے دم سے زندہ تھیں۔ بیدر کی بنی ہوئی فرشیاں اور بٹن، گلبرگہ کے نرم و نازک جوتے، اورنگ آباد کے ہیمرو اور گلبدن یہی لوگ بناتے تھے۔

یوں تو ان میں سے ہر صنعت اپنی جگہ بے نظیر تھی لیکن مجھے حیدر آباد کی جلد سازی کی صنعت بہت پسند آئی۔ میرا خیال ہے کہ محبوبیہ کارخانہ کی جلد سازی اپنا آپ جواب تھی۔ صناعی کا کمال دیکھیے کہ اس کارخانے کے ہنر مند جہاں پانچ روپیہ ہزار کے حساب سے یعنی ایک دھیلے میں ایک جلد بناتے تھے وہیں پانچ پانچ سو روپے کی جلدیں بھی تیار کرتے تھے جو اپنے طلائی کاموں کے حُسن و نفاست کے باعث پورے ملک میں مشہور تھیں۔

ایک صنعت ایسی تھی جس میں حیدر آباد کو پورے ملک میں اوّلیت اور افضلیت حاصل تھی، وہ تھی سگریٹ کی صنعت۔ وہاں کی چار مینار اور گولکنڈہ سگریٹ کی شہرت دور دور تک تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اتنی عمدہ اور اتنی سستی سگریٹ شاید ہی کہیں بنتی

ہو۔ یہ سگریٹ ایک دکنی صنعت کار کی ایجاد تھی۔ اُس وقت برطانوی ہند میں امپیریل تمباکو کمپنی کی اجارہ داری تھی مگر ایک دکنی صنعت کار کو سگریٹ بنانے کا نسخہ نہ جانے کہاں سے ہاتھ آگیا۔ اُس نے مشینیں منگوائیں اور چارمینار کے نام سے سگریٹ کا کارخانہ قائم کرلیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ سگریٹ دکن میں اتنی مقبول ہوئی کہ خاص وعام سبھی چارمینار پینے لگے۔ امپیریل کمپنی کے مالکوں نے جب دیکھا کہ دکن کا بازار اُن کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے تو انہوں نے چارمینار کے مالک سے کہا تم اپنا کارخانہ ہمارے ہاتھ فروخت کردو، اس نے انکار کیا تو انگریز حکام کے ذریعہ ریاست پر دباؤ ڈالا گیا۔ رشوتیں بانٹیں گئیں اور بالآخر چارمینار سگریٹ امپیریل کمپنی تمباکو کی ملکیت بن گیا۔ تب دکنی صنعت کار گولکنڈہ سگریٹ کے نام سے ایک نئ سگریٹ بازار میں لایا۔ گولکنڈہ سگریٹ بھی خوب چلی کیونکہ اس میں اور چارمینار میں مہک اور ذائقہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا اور دونوں سگریٹیں ایک آنہ میں بکتی تھیں۔ دکن کا یہ تحفہ شمالی ہند میں بہت پسند کیا جاتا تھا لیکن امپیریل تمباکو کمپنی نے اُس کی برآمد پر پابندیاں لگوادی تھیں تاکہ برطانوی ہند میں اُس کے سگریٹوں کی بکری پر اثر نہ پڑے۔

حیدرآباد کی دوسری صنعتوں میں بدری بٹن، گلبرگہ کے جوتے، کٹاؤ کے پاندان شامل تھے جن کی نقل تو برطانوی ہند کے کاریگر بھی کرلیتے تھے لیکن کوئی شخص گولکنڈہ اور چارمینار سگریٹ سے ملتی جلتی سگریٹ آج تک نہ بناسکا۔ یہ سگریٹ عوام اور متوسط طبقے میں تو مقبول ہی تھے لیکن اُمرا کے ایوانِ نشاط بھی اُن کے دھوئیں سے مہکتے رہتے ہیں۔

تہذیبی اعتبار سے دکن میں مسلمانوں کے تین گروہ تھے جن کی سوچ ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھی۔ اوّل خالص دکنی تھے جو صدیوں پیشتر مسلمان ہوئے تھے یا اُن کی اتنی پشتیں دکن میں گزر چکی تھیں کہ اب شمالی ہند سے اُن کا کوئی جذباتی

یا خاندانی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ دوسرے وہ خاندان تھے جن کو حیدر آباد میں سکونت اختیار کیے ابھی فقط دو تین پشتیں ہوئی تھیں۔ وہ تلاشِ معاش میں دکن گئے تھے۔ وہاں انہوں نے کوٹھیاں بنوالی تھیں، جائیدادیں خرید لی تھیں اور آرام سے رہتے تھے۔ اُن کی اولاد کا لہجہ، خوراک اور لباس دکنی تھا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو حیدر آبادی کہتے تھے لیکن شمالی ہندوستان سے اُن کا تعلق ابھی باقی تھا۔

تیسرا گروہ خالص غیر ملکیوں کا تھا۔ اُن لوگوں کو دکن یا دکن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

نظم و نسق کے اعتبار سے حیدر آباد دو حصوں میں تقسیم تھا۔ صرفِ خاص اور دیوانی۔ صرفِ خاص دراصل نظام کی ذاتی جاگیر تھی۔ اس کی آمدنی نظام کے ذاتی خزانے میں جاتی تھی۔ صرفِ خاص کے علاقے بے حد پسماندہ تھے۔ دیوانی کا علاقہ صرفِ خاص سے بڑا تھا۔ اس کا نظم و نسق حکومت سرکار عالی کے سپرد تھا۔ اختیارات کی تفویض اور تقسیم برطانوی ہند کے مانند تھی یعنی صدر اعظم اور اُس کی کابینہ۔ اس کے نیچے معتمدین اور نظما۔ پھر اورنگ آباد، گلبرگہ، رائچور اور ورنگل کے صوبہ دار یعنی کمشنر اور چودہ اضلاع میں ایک ایک تعلق دار یعنی ڈپٹی کمشنر۔ سکندر آباد، بلارم اور ترمل گری برطانوی علاقے تھے۔ وہاں ایک انگریز ریذیڈنٹ مقرر تھا اور اس کی مدد کے لیے گوروں کی ایک فوج وہاں رہتی تھی۔ ریاست حیدر آباد اور برطانیہ کے معاہدات کے مطابق نظام کو مکمل داخلی خود مختاری حاصل تھی مگر افرنگی سیاست نے عملاً نظام کو بے بس کر رکھا تھا۔ حکومت ریذیڈنٹ کی ایما کے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کہنے کو ایک مجلسِ قانون ساز بھی تھی لیکن اُس کی حیثیت خالص مشاورتی تھی اور ارکانِ مجلس سب کے سب نامزد کیے جاتے تھے۔ ریاست کے باشندوں کو انتخاب کا حق نہ تھا اور نہ نظم و نسق میں ان کو کوئی دخل تھا۔ جمہوری آزادی اور شہری حقوق برطانوی ہند کے باشندوں کو

کب حاصل تھے جو دکن کے باشندوں کو ملتے۔ حکومت کی اجازت کے بغیر نہ کوئی جماعت بن سکتی تھی نہ اخبار جاری کیا جا سکتا تھا اور نہ جلسہ ہو سکتا تھا۔

اُس زمانے میں حیدر آباد میں سیاسی سرگرمیاں مفقود تھیں لیکن تہذیبی اور علمی مشاغل پر کوئی پابندی نہ تھی چنانچہ محلے محلے ادبی انجمنیں بنی ہوئی تھیں۔ مشاعرے بڑی پابندی و باقاعدگی سے منعقد کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات علمی اور ادبی مذاکرے بھی ہوتے تھے یا کسی خاص موضوع پر کسی ماہرِ فن کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ ایک صنفِ ادب و فن تو ایسی تھی جس میں دکنی نوجوان منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ وہ تمثیل نگاری کی صنف تھی چنانچہ حیدر آباد میں ڈرامہ لکھنے اور ناٹک کھیلنے والوں کی دو تین انجمنیں قائم تھیں۔ یہ انجمنیں سال میں تین چار ڈرامے ضرور پیش کرتیں۔ یہ ڈرامے عام طور پر معاشرتی یا مزاحیہ ہوتے تھے اور اُن کو دیکھنے کے لیے سارا شہر ٹوٹ پڑتا تھا۔ تمثیلی انجمنوں کا مقصد حصولِ زر نہ تھا بلکہ دانشوروں نے اپنے جمالیاتی شوق کی تسکین اور اظہار کے لیے یہ میدان منتخب کیا تھا۔ مولوی فضل الرحمان، جناب اکبر وفاقانی، سید بادشاہ حسین، مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن حیدر آباد کی تمثیلی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ حضرات خود ناٹک لکھتے، ہدایت کاری کے فرائض انجام دیتے اور بوقتِ ضرورت اداکاری بھی کرتے تھے۔

مجھے مخدوم کا ڈرامہ "پھول بن" خاص طور سے یاد ہے۔ یہ ڈرامہ دراصل چیخوف کے مشہور ڈرامے (CHERRY ORCHARD) کا چربہ تھا۔

CHERRY ORCHARD ایک علامتی اور طنزیہ ڈرامہ تھا جس میں چیخوف نے روس کے جاگیر داری نظام کے زوال اور سرمایہ داری نظام کے آغاز کا نقشہ کھینچا تھا۔ مخدوم نے ماحول اور کرداروں کے نام بدل دیے اور مکالموں میں جابجا ایسے اشارے رکھ دیے کہ "پھول بن" کا وار حیدر آباد کے جاگیری نظام پر بھرپور پڑا۔

تماشائیوں کو تو پتہ چل گیا کہ روئے سخن کس کی طرف ہے مگر محتسب گرفت نہ کرسکے۔

حیدر آباد کے لوگوں کو اخبار بینی اور کتب بینی کا جنون تھا۔ شہر میں کتابوں کی بہ کثرت دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر لاہور، دہلی، لکھنؤ، بمبئی، غرض ہر جگہ کی مطبوعات آسانی سے دستیاب ہوتی تھیں اور لوگ ان کتابوں اور رسالوں کو بڑے شوق سے خرید کر پڑھتے تھے۔ ایک دکان انگریزی کتابوں کی بھی تھی۔ اس کا نام حیدر آباد بک ڈپو تھا۔ میں اس دکان کو دیکھ کر ششدر رہ گیا کیونکہ تاراپور والا کے علاوہ ایسی شاندار دکان پورے ہندوستان میں نہ تھی۔ یہ دکان تین چار بھائیوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔ ان کا علمی ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ یہ لوگ حیدر آباد کے ایک مشہور گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تعلیم یورپ میں ہوئی تھی۔ ایک بھائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ دوسرے بھائی جامعہ عثمانیہ میں عمرانیات کے اُستاد تھے اور اُردو زبان اور رسم الخط کو آسان بنانے کے تجربے کرتے تھے۔ تیسرے بھائی فرانسیسی زبان کے عالم تھے اور بہت دن تک آربندو گھوش کے آشرم میں پانڈی چری میں رہ چکے تھے۔

اس دکان پر ہر موضوع کی کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ فلسفہ، معاشیات، تاریخ، فنونِ لطیفہ، ادب، ناول غرض یہ دکان انگریزی کی جدید ترین مطبوعات سے پٹی رہتی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ حیدر آباد بک ڈپو میں مارکس، اینگلس، لینن اور دوسرے اشتراکی مصنفوں کی مستند تصانیف اعلانیہ فروخت ہوتی تھیں اور کوئی اعتراض نہ کرتا تھا حالانکہ اس قسم کی کتابیں ہندوستان میں ممنوع تھیں بلکہ ان کا داخلہ بھی بند تھا۔ اس دکان کے مالکوں سے گفتگو کرنے میں بہت مزہ آتا تھا اور ان کے پاس سے آدمی کچھ نہ کچھ سیکھ کر اُٹھتا تھا۔

آج کل کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے لیکن میں اپنے پرانے تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اخبار کے دفتر میں قوم کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے بشرطیکہ اخبار

نویس سننا چاہیے۔ "پیام" کے دفتر کی یہی کیفیت تھی، وہاں بھانت بھانت کے لوگ آتے اور اپنے مسائل ہم سے بیان کرتے تھے۔ جن لوگوں کا مسئلہ ذاتی یا کاروباری ہوتا تھا وہ قاضی صاحب سے ملتے تھے البتہ جن لوگوں کا اخبار سے کوئی کام پڑتا وہ میرے پاس آتے تھے، اُن میں جامعہ عثمانیہ، سٹی کالج یا نظام کالج کے دو چار طلبا ضرور ہوتے تھے۔ کسی کو اپنی غزل یا نظم چھپوانی ہوتی تھی، کوئی مضمون لکھ کر لاتا، کسی کو "پیام" کے اداریے یا خبروں کے بارے میں کچھ کہنا ہوتا بعض یوں ہی سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کی غرض سے آجاتے تھے۔ غرضیکہ ان نوجوانوں کے ساتھ روزانہ میرے ایک دو گھنٹے گزرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دس بارہ طلبا کا ایک حلقہ بن گیا جو ہمارے خیالات سے متفق تھا۔

اتفاق سے انہیں دنوں طلبائے ہند کے ایک نیم اشتراکی لیڈر جن کا نام ایم ایل شاہ تھا سکندر آباد میں وارد ہوئے۔ بمبئی سے وہ میرے ایک دوست کا تعارفی خط لائے تھے اور چاہتے تھے کہ میں حیدر آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخ قائم کرنے میں اُن کی مدد کروں۔ میں نے انہیں چند طلبا سے ملا دیا۔ انہوں نے مسٹر شاہ سے کہا کہ آپ انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ کے عہدیداروں سے ملیں اور مشورہ کریں۔ چنانچہ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ مخدوم اور میں اُن کو لے کر جامعہ عثمانیہ گئے۔ انجمن اتحاد کے عہدیداروں نے مسٹر شاہ کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا۔ مسٹر شاہ نے اپنی انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور کہا کہ آپ لوگ بھی اسی قسم کی ایک انجمن یہاں بنائیں اور اس کا الحاق ہماری انجمن سے کرلیں۔ حیدر آباد کے لوگ بہت مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مہمان کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ ان کی تجویز کے حق میں بھی نہ تھے، اس لیے خاموش ہوگئے مگر ہم لوگ اس خاموشی کے معنی سمجھ گئے۔ ہم نے مسٹر شاہ سے کہا کہ آپ کی یہ تجویز تو بہت مناسب ہے کہ طلبا حیدر آباد کی ایک انجمن ہونی چاہیے تاکہ طلبا کے تعلیمی مسائل حل کیے جاسکیں اور اُن میں اتحاد اور یکجہتی پیدا ہو لیکن اس

انجمن کا الحاق کُل ہند اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ہرگز نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی جماعت کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور آپ کا لائحۂ عمل حیدر آباد کی حد تک بالکل ناقابلِ عمل ہے۔

اس گفتگو کے بعد کھانے کا وقت آیا۔ طلبا نے بیرونی مہمان کے اعزاز میں بڑی پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا تھا لیکن وہاں یہ عالم تھا کہ لڑکے جو چیز مسٹر شاہ کے سامنے پیش کرتے وہ معذرت کر دیتے۔ تب یہ راز کھلا کہ موصوف سبزی خور واقع ہوئے ہیں۔ لڑکوں کو بڑی کوفت ہوئی اور مسٹر شاہ نے تلے ہوئے انڈوں اور آلو سے پیٹ بھرا۔

مسٹر شاہ کے بمبئی واپس چلے جانے کے بعد ہمارے حلقے کے نوجوان طلبا نے جن میں عالم خوند میر اور سری نواس لاہوٹی پیش پیش تھے طلبا کی انجمن بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ آئین و اغراض و مقاصد بڑی احتیاط سے لکھے گئے تاکہ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملے اور انجمن کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔

جس طرح حیدر آباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں اُردو زبان کی پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی اسی طرح اُردو زبان کے قدیم مخطوطات کی تلاش و اشاعت کا سہرا بھی اہلِ دکن کے سر ہے۔ اس کاروانِ شوق کے قافلہ سالار مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ انہوں نے ان مخطوطات کی جستجو اور ترتیب و تدوین میں ایک عمر صرف کر دی۔ پرانے کتب خانوں کی چھان بین کی، خانقاہوں کے طواف کیے، شہروں شہروں مارے مارے پھرے اور جہاں کہیں کسی قدیم نسخے کا سراغ مِلا اسے حاصل کیا لیکن ان کہن سال کتابوں کی بہم رسانی سے زیادہ کٹھن کام کرم خوردہ تحریروں کو پڑھنا، سمجھنا، اُن کے متن کو درست کرنا، اُن کی فرہنگ تیار کرنا اور اُن پر حواشی لکھنا تھا مگر مولوی صاحب دُھن کے پکّے تھے چنانچہ اُن کی انتھک کوششوں سے دکن کے ایسے ایسے قدیم شاعروں اور نثر نگاروں کی تحریریں منظرِ عام پر آئیں جن کے نام سے اہلِ علم بھی ناواقف تھے۔ اس تحقیق کے بعد سلطان

قلی قطب شاہ جو اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار پایا اور وجہی، نصرتی اور ابنِ نشاطی وغیرہ کی تحریروں سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شاہ جہاں اور ولی دکنی سے بہت پہلے دکن میں اُردو نثر اور نظم کے بڑے بڑے اہلِ قلم پیدا ہو چکے تھے۔ ان مخطوطات کی اشاعت سے اُردو زبان کی عمر میں تین چار سو برس کا اضافہ ہو گیا۔ لوگوں کے دلوں میں دکن کے تہذیبی ورثے کی اہمیت اور بڑھ گئی اور دکن کے باشعور حلقوں میں اپنے پُرانے شاعروں کے مطالعہ کا اور ان کی یاد تازہ کرنے کا خیال پیدا ہونے لگا۔

یومِ ولؔی اس سلسلے کی پہلی کڑی تھا۔ چنانچہ حیدر آباد میں یہ دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اخباروں اور رسالوں کے ولی نمبر نکلے۔ نشر گاہِ حیدر آباد نے کئی شامیں ولؔی کے کلام کے لیے وقف کر دیں اور مقالے نشر کیے۔ شاعروں نے اپنی نظموں میں ولؔی کو نذرِ عقیدت پیش کی۔ ایک جلسہء عام نواب سالار جنگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر دکن کے کئی نامور ادیبوں نے ولؔی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مخدوؔم نے اپنی نظم نذرِ ولؔی اسی جلسے میں پڑھی تھی۔ ولؔی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مخدوؔم نے کہا تھا کہ

صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولؔی آیا
مبارک بادیاں گائیں بہاروں نے ولؔی آیا
ولؔی وہ ہمدمِ فطرت وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اوّلیں تلمیذِ رحمانی
یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا
دیے روشن کیے مندر میں کعبہ کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کر دیں دل کے داغوں سے

وہ میراثِ جہاں، وہ خلد کا پیغام آتا ہے

دکن کی سرزمین پر زندگی کا جام آتا ہے

جشن ولی تو ولی کی وفات کے کئی سو سال بعد منعقد ہوا لیکن حیدر آباد بجا طور ناز کر سکتا ہے کہ میرے گھر میں یومِ اقبال علامہ اقبال کی زندگی ہی میں بڑے اہتمام سے منایا گیا۔

علامہ اقبال کو دکن سے بڑی اُلفت تھی۔ وہ حیدر آباد کو اسلامی ریاست تصور کرتے تھے اور نظام کی بھی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ پہلی بار نظام سے ملے تو انہوں نے نظام کی خدمت میں ایک مختصر سا قصیدہ بھی پیش کیا جس کی جھلکیاں نظر حیدر آبادی کی کتاب ''اقبال اور حیدر آباد (دکن)'' میں بھی ملیں گی۔ قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

اے مقامت برتر از چرخِ بریں

از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں

از تو مارا صبحِ خنداں شامِ ہند

آستانت مرکزِ اسلام ہند

بندگاں ہستیم ما، تو خواجہ

از پئے فردائے ما دیباچہ

علامہ اقبال حیدر آباد کی خدمت کے ہمیشہ آرزو مند رہے لیکن انہیں کبھی اس کا موقع نہ ملا۔ کئی بار افواہیں اڑیں کہ اقبال حیدر آباد کے چیف جسٹس مقرر ہو گئے ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں لیکن یہ افواہیں کبھی حقیقت نہ بن سکیں اور اقبال یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے کوچ کر گئے۔ حیدر آباد کے لوگوں کو بھی علامہ اقبال کی ذات اور شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ جس زمانے میں میں حیدر آباد میں تھا ان کا دوسرا مجموعہ بالِ جبریل شائع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جتنے نسخے اس کتاب کے وہاں

فروخت ہوئے کسی شہر میں فروخت نہ ہوئے ہوں گے۔

یومِ اقبال کا جلسہ باغ عام کے بڑے ہال میں ہوا تھا۔ پہلی نشست کی صدارت نواب اعظم جاہ نے کی تھی اور دوسری نشست کی مہاراجہ کشن پرشاد نے۔ مہاراجہ کا انتخاب تو نہایت موزوں تھا کیونکہ وہ علامہ اقبال کے دیرینہ دوست اور کرم فرما تھے اور علامہ اقبال حیدرآباد میں ان کے مہمان بھی رہے تھے، یوں بھی مہاراجہ اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے لیکن نواب اعظم جاہ کو شعروشاعری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نظام کے لڑکوں میں فقط نواب معظم جاہ کرسیِ صدارت پر بیٹھنے کے لائق تھے۔ شاعر ہونے کے علاوہ نواب معظم جاہ کے دربار میں ساری ساری رات شعروشاعری کا چرچا رہتا تھا۔ جوشؔ، فانیؔ، صدق جائسی، ماہر القادری (جو اس وقت مولانا نہیں ہوئے تھے) اُن کی محفل میں برابر شریک ہوتے تھے۔

یومِ اقبال کے جلسے میں رابندر ناتھ ٹیگور، آغا خان، نواب بھوپال، سرسکندر حیات، نواب رامپور، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ سراکبر حیدری صدرِ اعظم نے بھی ایک مختصر سی تقریر اقبالؔ کے بارے میں کی تھی لیکن خاص تقریریں ڈاکٹر سید عبداللطیف، نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر محی الدین زورؔ اور مخدومؔ نے کی تھیں۔ اس موقع پر اخباروں نے خاص مضامین اور اداریے بھی شائع کیے تھے۔

حیدرآباد کے ایک مشاعرے کی بدولت مجھے مخدوم کی دوستی نصیب ہوئی تھی، یومِ اقبالؔ کی بدولت مجھے سردار جعفری جیسا عزیز دوست ملا۔ ہوا یوں کہ میرے مضمون کو شمالی ہند کے بعض پرچوں نے نقل کیا۔ اتفاقاً یہ مضمون سردار جعفری کی نظر سے بھی گزرا جو اُن دنوں سیاسی عقائد کے باعث مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکالے جاچکے تھے اور عربک کالج دہلی میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں اقبالؔ پر مضامین کا ایک

مجموعہ مرتب کر رہا ہوں تم اپنا مضمون مجھے بھیج دو۔ میں نے مضمون کی نقل بھیج دی اور اس طرح ہماری خط و کتابت کی ابتدا ہوئی۔

حیدر آباد کی سرزمین طالع آزماؤں کو اکثر راس آتی تھی، جو جاتا تھا فیضیاب ہوتا تھا۔ ملازمت، وظیفہ یا نقد روپیہ، کچھ نہ کچھ ضرور ہاتھ آجاتا تھا لیکن قسمت کی محرومی دیکھیے کہ بعض لوگوں کو دکن کے بحرِ سخاوت سے شبنم کے چند قطرے ہی ملے۔ اس میں کچھ دخل ان حضرات کی افتادِ طبع کا تھا اور کچھ وہاں کے حالات کا۔ بعض حضرات مثلاً جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری حادثات ہی کا شکار ہوئے۔ ایک بار حفیظ صاحب حیدر آباد تشریف لائے اور قاضی صاحب کے مہمان ہوئے۔ جناب حفیظ جالندھری کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ انہوں نے یونین میں شاہنامۂ اسلام کے چند ٹکڑے طلبا کو سنائے تھے اور اب حیدر آباد اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے تاکہ شاہنامے کی بقیہ جلدیں اطمینانِ قلب سے مکمل کی جاسکیں۔ قاضی صاحب اُن کے گہرے دوست تھے چنانچہ قاضی صاحب نے انہیں ہوش بلگرامی سے بھی مِلوادیا جو ان دنوں حضور نظام کی ناک کے بال بنے ہوئے تھے۔ سر کشن پرشاد نے بھی حفیظ کو نوازا تھا مگر حفیظ صاحب میں شاید کوئی باغیانہ رگ ہے جو کبھی کبھار پھڑک اٹھتی ہے۔ حیدر آباد کے قیام میں ایک بار یہ رگ ایسی پھڑکی کہ حفیظ صاحب کو لینے کے دینے پڑگئے۔ ہوا یہ کہ جامعہ عثمانیہ میں بڑا شاندار مشاعرہ تھا۔ مہاراجہ شآد صدارت کرنے والے تھے۔ ہم لوگوں نے حفیظ صاحب سے، جو نوجوانوں میں بیٹھ کر بڑی انقلابی باتیں کرتے تھے، کہا کہ آپ اس مشاعرے میں کوئی انقلابی نظم پڑھ دیں تو ہم جانیں۔ حفیظ صاحب نہ جانے کس دُھن میں تھے، حامی بھر لی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حفیظ صاحب واقعی کوئی "انقلابی" نظم لکھیں گے۔ مگر ایک دن دیکھا تو حفیظ صاحب جھومتے جھامتے چلے آرہے ہیں۔ دور سے پکار کر بولے "سیطا نظم

ہو گئی" میں نے کہا سنائیے...... بولے، ابھی نہیں مشاعرے میں سننا۔ غرض مشاعرے کا دن آیا قاضی صاحب نے تو جانے سے انکار کر دیا البتہ حفیظ صاحب اور میں قاضی صاحب کی موٹر میں یونیورسٹی پہنچے۔ وہاں مخدوم، ظفر، شہاب سب موجود تھے۔ میں نے ان لوگوں سے ماجرا بیان کیا لیکن کسی کو یقین نہ آیا کہ حفیظ مہاراجہ کے روبرو کوئی انقلابی نظم پڑھنے کی جرأت کریں گے۔ مشاعرہ شروع ہوا تو بہت رات گئے حفیظ صاحب کی باری آئی۔ سامنے مہاراجہ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے روبرو نیم دائرے کی شکل میں دوسرے وزرا اور عمائدین ریاست دستار اور بگلوس باندھے باادب بیٹھے تھے۔ جب مائکروفون حفیظ صاحب کے سامنے آیا تو انہوں نے ایک لمبا سا کاغذ جیب سے نکالا، چشمے کو صاف کیا اور اپنے مخصوص ترنم سے نظم پڑھنی شروع کی۔ مطلع تھا۔

شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں کھائیں پئیں آنند رہیں

کالج کے لڑکے حفیظ صاحب کے روایتی کلام سے واقف تھے۔ پہلے تو انہیں یقین نہ آیا لیکن جب حفیظ صاحب نے مطلع کو دہرایا تو سارا ہال واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں سے گونجنے لگا۔ دو تین شعر کے بعد ہی لڑکے بالکل بے قابو ہو گئے اور لگے اچھل اچھل کر داد دینے۔ اُدھر لڑکوں کا یہ حال اِدھر مہاراجہ کا یہ عالم کہ انہوں نے ایک بار حفیظ صاحب کو غور سے دیکھا پھر جو سر نیوہڑا کر بیٹھے تو آخر تک یونہی گردن نیچی کیے خاموش بیٹھے رہے۔ نائب امیر جامعہ اور یونیورسٹی کے دوسرے عہدے دار دم بخود اور لڑکے تھے کہ ہر شعر پر خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے۔ بارے نظم ختم ہوئی تو مخدوم نے چپکے سے کہا "حفیظ صاحب! والدہ سے دودھ بخشوا کر آئے ہیں نا؟" حفیظ بولے، "یار تم عجیب آدمی ہو۔ خود ہی فرمائش کی کہ انقلابی نظم لکھو اور جب میں نے لکھ دی تو تم مجھے یوں ڈرا رہے ہو۔" حفیظ صاحب کے بعد ظاہر ہے لڑکے کسی اور کا کلام سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مہاراجہ نے

یہ رنگ دیکھا تو ناسازیِ مزاج کا بہانہ کر کے اُٹھ گئے۔ اُن کے جاتے ہی دوسرے وزرا بھی رخصت ہو گئے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔

دوسرے دن حفیظ صاحب نے سارا ماجرا قاضی صاحب کو سنایا۔ انہوں نے سر پیٹ لیا اور حفیظ صاحب کو خوب ڈانٹا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو لڑکوں کے کہنے میں آ گئے، پھر حفیظ صاحب کو موٹر میں بٹھا کر ہوش صاحب کے پاس لے گئے۔ وہاں نہ جانے کیا مشورے ہوئے۔ بہر حال حفیظ صاحب دوسرے ہی دن ایک بڑے بااثر نواب صاحب کی کوٹھی میں بنجارہ ہل منتقل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد وطن واپس چلے گئے مگر ان کو تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مل ہی گیا۔

حضرت فانیؔ بدایونی اور مولانا ابوالخیر مودودی جیسے شاہانہ مزاج کے لوگ حیدر آباد میں بہت خوار ہوئے۔ فانیؔ قاضی صاحب کے بہت گہرے دوست تھے۔ وہ ناندیر میں صدر مدرس تھے البتہ چھٹیوں میں حیدر آباد آجاتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب بھی فانیؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ فانیؔ کا حیدر آباد میں سارا وقت اس کوشش اور پیروی میں گزرتا تھا کہ کسی طرح میرا تبادلہ ناندیر جیسی کوردہ جگہ سے حیدر آباد میں ہو جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ نواب مہدی یار جنگ صدر المہام تعلیمات اُن سے ناراض تھے اور ایسے ناراض تھے کہ مولوی صاحب اور قاضی صاحب کی دوڑ دھوپ بھی فانیؔ کے کام نہ آئی اور فانی کا تبادلہ حیدر آباد نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ سُنتا ہوں کہ آخر عمر میں انہوں نے سرکاری ملازمت ترک کر دی تھی اور نواب معظم جاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور نشرگاہِ حیدر آباد کے علم دوست کارکنوں کی وجہ سے انہیں ماہانہ سو روپے کے پروگرام ملنے لگے۔

فانیؔ یوں تو مشرقی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے لیکن انہیں اردو رسم الخط سے سخت چڑ تھی۔ اس کے برعکس وہ رومن رسم الخط کے بڑے حامی تھے چنانچہ اپنی غزلیں

انگریزی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرتے تھے۔ اس موضوع پر اُن میں اور مولوی صاحب میں خوب خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ مولوی صاحب سے فانی کی دلیلوں کا جواب نہ بن پڑتا تو غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور فانی کو جی بھر کر برُا بھلا کہتے مگر فانی ہنستے رہتے تھے۔ فانی کو مولوی صاحب کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے ملنے جاتے تو تین چار غزلیں رومن رسم الخط میں ٹائپ کر کے ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ مولوی صاحب فانی سے بڑی محبت سے ملتے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد تان لامحالہ فانی کی شاعری پر ٹوٹتی۔ مولوی صاحب کہتے کوئی نئی چیز لکھی ہو تو سناؤ۔ فانی مسکرا کر ٹائپ شدہ غزلیں جیب سے نکالتے اور مولوی صاحب کی طرف بڑھا دیتے اور مولوی صاحب ان کاغذوں کو یوں اٹھا کر پھینک دیتے گویا اچانک بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ فانی ہنستے ہوئے تمام کاغذ فرش سے اٹھا لیتے اور غزلیں سُنانے لگتے۔ غزلیں سن کر مولوی صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا تھا۔

پُرانے زمانے میں شعر کہنا اُردو شاعروں کا کُل وقتی مشغلہ تھا۔ شاید اُنہیں اور کوئی ہنر آتا ہی نہ تھا۔ بیچارے کسی سرکار دربار سے وابستہ ہو جاتے تھے تاکہ بے فکری سے فکرِ سخن کر سکیں۔ پھر بھی اُن کی زندگی ہمیشہ عُسرت ہی میں بسر ہوتی تھی۔ اس وقت نہ مشاعروں میں شرکت کا معاوضہ ملتا تھا نہ ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن تھے جہاں سے شاعر کو اپنا کلام نشر کرنے پر کچھ رقم ہاتھ آجاتی ہو۔ معاوضہ دینے والے اخبار اور رسالے بھی نہ تھے۔ اس وقت تو دیوان بھی چھپتے تو صاحبِ دیوان کو دس پانچ اعزازی نسخوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔

فانی کی زندگی اُردو ادب کا ایک المیہ ہے۔ ان کے زمانے میں شاعروں کو وہ تمام سہولتیں حاصل نہ تھیں جو اُوپر بیان کی گئی ہیں لیکن فانی کُل وقتی شاعر نہ تھے اور نہ کُل وقتی شاعر بننا چاہتے تھے۔ اُن کے پاس وکالت کی ڈگری تھی مگر اُن کی طبیعت اس پیشے سے

بھی منحرف تھی لہٰذا وہ کبھی اچھے وکیل نہ بن سکے۔ وہ دکن یہ سوچ کر گئے تھے کہ وہاں کوئی معقول سی ملازمت مل جائے گی تو زندگی آرام سے بسر ہو گی اور شعر و شاعری کا مشغلہ بھی جاری رہے گا لیکن وہاں اقبال جیسوں کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں تو بدایوں کے ایک قنوطی شاعر کو کون پوچھتا اور کیوں پوچھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وہاں نہ مالی آسودگی حاصل ہوئی اور نہ اُن کی شاعری کو فروغ ہوا۔

مولوی ابوالخیر مودودی[1] دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی کے عالم تھے۔ گو مذاہبِ عالم سے سخت بیزار رہتے تھے۔ دارالترجمہ میں مولانا عبداللہ عمادی کے مددگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اُن کی شادی حیدر آباد کے ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کا خرچ اُن کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ابوالخیر صاحب دوسرے تیسرے روز قاضی صاحب سے ملنے تشریف لاتے تھے لیکن اس نوابی شان سے کہ موٹر احاطے میں آکر رُکتی تو ڈرائیور اُتر کر دروازہ کھولتا۔ تب ابوالخیر صاحب نیچے اُترتے۔ ملازم جو برابر ساتھ رہتا تھا مودودی صاحب کا چاندی کا پاندان اور ناگردان سنبھالتا۔ مودودی صاحب کمرے میں داخل ہونے لگتے تو ملازم بڑھ کر چلمن اٹھاتا۔ مودودی صاحب صوفے پر بیٹھ جاتے اور اس احتیاط سے کہ شیروانی یا پاجامے پر کوئی شکن نہ پڑنے پائے۔ جیب سے رومال نکالتے تو سارا کمرہ عطر کی خوشبو سے مہک اٹھتا۔ ملازم پاندان سامنے رکھ دیتا۔ ابوالخیر صاحب پاندان کھول کر چاندی کی ایک نازک سی قینچی نکالتے۔ بڑی نفاست سے پان کے پتوں کی نوک پلک درست کرتے تب پاندان کھلتا اور کیوڑے میں بسے ہوئے کتھے چونے کی ڈبیوں سے جن کی چمچیاں بھی چاندی کی ہوتی تھیں پان لگائے جاتے تھے۔ بازاری پان کو وہ چھوتے تک نہ تھے۔

ابوالخیر صاحب نہایت مہذب اور شائستہ انسان ہیں۔ میں نے انہیں کبھی اُونچی

---

[1] ۔ مولانا مودودی کے بڑے بھائی تھے، اب وفات پا چکے ہیں۔

آواز سے بولتے یا کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ عام لوگوں سے مزاج میں بڑی انکساری اور نیاز مندی سے ملتے لیکن صاحبِ ثروت حضرات کے رُوبرو اُن میں بلا کی رعونت، قیامت کا غرور آجاتا تھا۔ پاکستان کی مانند حیدر آباد میں بھی افسر حضرات اپنے ماتحتوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ عید، بقر عید کے موقع پر لوگ انہیں سلام کرنے حاضر ہوں۔ ابوالخیر صاحب اس بدعت کے کبھی مرتکب نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حُکّامِ بالا اُن سے کبھی خوش نہ ہوئے۔ اِسی وجہ سے دارالترجمہ کے ناظم صاحب سے بھی ان کی کبھی نہ بنی اور بالآخر مودودی صاحب کو ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں لچک بالکل نہیں ہے۔ وہ جھکنا جانتے ہی نہیں خواہ سر پر مصائب کے پہاڑ کیوں نہ گر پڑیں۔

بہت مدت کے بعد حیدر آباد کے اس بانکے کو لاہور میں دیکھا۔ سُوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ چہرے کی آب و تاب زائل ہو چکی تھی اور افکار کی لکیریں اُبھر آئی تھیں مگر اسی خندہ پیشانی سے ملے۔ نہ زمانے کا شکوہ نہ احباب کا گلہ۔ وہی پرُانی شانِ استغنا، وہی بے نیازی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ اتنی ہمت نہ ہوئی کہ پوچھتا کہ حضرت کیا مشغلہ ہے۔ بال بچوں کا خرچ کیسے چلتا ہے۔ ریڈیو والوں نے کئی بار نشری تقریروں کی درخواست کی۔ معاوضہ بھی معقول پیش کیا لیکن معاوضہ لے کر لکھنا ابوالخیر صاحب کے اُصول کے خلاف تھا اس لیے انکار کر دیا۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور مگن رہتے ہیں۔ نہ کسی سے ملتے ہیں نہ کہیں آتے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں قلندروں کی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں۔

میرے زمانۂ قیام میں حیدر آباد کا سب سے اہم مسئلہ وفاق کا تھا۔ سیاسی تنظیموں کی تو وہاں اجازت نہ تھی کہ جلسے ہوتے اور قرار دادیں منظور کی جاتیں لیکن چاۓ خانوں میں، اخباروں میں اور نجی محفلوں میں وفاق پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ نئے قانونِ ہند کے دو اجزا تھے۔ صوبائی خود مختاری اور وفاقی مرکز۔ مرکز کی حد تک برطانوی حکومت اس فکر میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اجارہ داری بدستور قائم رہے کیونکہ مرکز کے

اختیارات بہت وسیع تھے۔ فوج، تار، ڈاک، ریلوے، درآمدی اور برآمدی محصول سب مرکزی شعبے تھے۔ اس اجارہ داری کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ یہ کہ دیسی ریاستوں کو وفاق میں شرکت پر آمادہ کیا جائے اور ریاستی نمائندوں کی مدد سے صوبائی نمائندوں کو شکست دی جاسکے چنانچہ وفاق کی حد تک ملک کو دو وحدتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک وحدت صوبوں کی تھی اور دوسری ریاستوں کی البتہ صوبوں کی اشک شوئی کے لیے یہ شرط رکھ دی گئی تھی کہ دیسی ریاستیں الحاق سے پہلے اپنی رعایا کو تھوڑی بہت آئینی مراعات ضرور دیں۔

مجلسِ اتحاد المسلمین اس وقت تک فعال جماعت نہیں بنی تھی لیکن مجلس کے لیڈر اور ملکی تحریک کے عناصر وفاق کے سخت مخالف تھے۔ اُن کی رائے میں الحاق سے ریاست کی خود مختاری اور آزادی پر حرف آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دکن کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی غالب اکثریت صدقِ دل سے یہی محسوس کرتی تھی کہ حیدر آباد ایک خود مختار اور آزاد مملکت ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز وائسرائے ہند کی ذات ہے لیکن اُن کی دِلی تمنا تھی کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ حیدر آباد کا زائل شدہ اقتدارِ اعلیٰ بحال ہو جائے اور وہ بہ بانگِ دُہل کہتے تھے کہ آزاد تھے، آزاد ہیں، آزاد رہیں گے۔

اس کے برعکس نیشنلسٹ خیال کے لوگ جن کی غالب اکثریت ہندو تھی وفاق کے حق میں تھے اور آئینی اصلاحات کے آرزو مند تھے۔ یہ لوگ دیسی ریاستوں کو ملک کی آزادی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وفاق میں شرکت سے والیانِ ریاست کی مطلق العنانیاں کم ہو جائیں گی اور ریاستی رعایا کو دیر سویر وہ جمہوری حقوق مِل جائیں گے جو برطانوی ہند کے باشندوں کو حاصل ہیں۔

سر اکبر حیدری حیدر آباد کے سب سے بااثر وزیر تھے۔ اس کا اندازہ ایک شعر سے ہو سکتا ہے جو اُن کے کسی خوشامدی شاعر نے لکھا تھا۔

نشانِ حیدری شانِ سر اکبر
سر اکبر حیدری اللہ اکبر

یوں کہنے کو تو وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد تھے لیکن حکومت کی باگ دراصل سر اکبر کے ہاتھ میں تھی۔ مگر وہ انگریزوں کے آوردہ اور پروردہ تھے اور سرکاری کاسہ لیسوں کے علاوہ ملک کا کوئی حلقہ نہ اُن کا حامی تھا اور نہ انہیں پسند کرتا تھا البتہ سر اکبر حیدری اور مولوی عبدالحق صاحب بہت پرانے دوست تھے۔ دراصل سر اکبر کو سر اکبر بنانے میں مولوی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا کیونکہ اُن دنوں حیدر آباد میں مولوی صاحب کی حیثیت بادشاہ گر سے کم نہ تھی۔ حیدر آباد میں ممتاز اور بااثر اخبار دو ہی تھے۔ ایک "رہبرِ دکن" دوسرا "پیام"۔ "رہبرِ دکن" مجلس اتحاد المسلمین کا حامی اور وفاق کا مخالف تھا۔ "پیام" اتحاد المسلمین کی سیاست کا مخالف اور وفاق کا حامی تھا۔ قاضی صاحب مذہبی مناقشوں اور فرقہ وارانہ تنظیموں کے سخت دشمن تھے اور فرقہ وارانہ سیاست پر، خواہ وہ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی، کڑی نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ وہ وفاق کی حمایت نہایت خلوص سے کرتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس حمایت کا ڈانڈا مولوی عبدالحق اور علی یاور جنگ کی وساطت سے سر اکبر حیدری کی سیاست سے ملتا تھا اور سر اکبر کی سیاست انگریزوں کی سیاست تھی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ زمانہ ایسی کروٹ بدلے گا کہ نہ انگریز باقی رہیں گے نہ دیسی ریاستیں۔

حیدر آباد بظاہر برطانوی ہند سے الگ تھلگ ایک بستی تھی لیکن اس بستی کے باشندے بیرونی ملکوں کے حالات سے قدرتی طور پر متاثر ہوتے تھے چنانچہ حبشہ پر مسولینی کا حملہ، بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری، ہسپانوی خانہ جنگی، آسٹریا اور چیکوسلواکیہ پر ہٹلر کا قبضہ، ایسے حادثات تھے جن کے عواقب و نتائج سے حیدر آباد کے نوجوان دانشور اور طالبِ علم بخوبی آگاہ تھے اور فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کو

شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ برطانوی ہند میں تو ہٹلر اور مسولینی کے جارحانہ حملوں کے خلاف زبردست مظاہرے ہوتے تھے مگر حیدر آباد میں غم و غصے کا اظہار فقط اخباروں میں کیا جاسکتا تھا۔

ظفرؔ کے چوبارے میں اکثر ان مسائل پر بحثیں ہوا کرتیں۔ ہم لوگ مخدومؔ کو چھیڑتے کہ یار تم تو اپنے آپ کو سِدی کہتے ہو۔ تمہارے آبائی وطن حبشہ پر حملہ ہو رہا ہے پھر بھی تمہاری رگِ حمیّت نہیں پھڑکتی۔ مخدوم ہنس کر چپ ہو جاتا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا کہ مخدومؔ آیا اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری میز پر پھینک دیا۔ میں نے اُٹھا کر پڑھا۔ یہ مخدومؔ کی نظم "جنگ" تھی۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی

عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رُک رہی ہے سینہ میں تہذیب نو کی سانس

امن و اماں کی نبض چھُٹی جا رہی ہے کیوں
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں

اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

بربطِ نوازِ بزمِ الوہی اِدھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی اِدھر تو آ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیداریاں تو دیکھ

معصومۂ حیات کی بے چارگی تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسن کی غارتگری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو
او انجمِ حمیّتِ یزداں طلوع ہو

یہ نظم دوسرے دن پیامؔ کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی۔ حیدر آباد کی تاریخ میں یہ

پہلی سیاسی نظم تھی جس میں جنگ پر یوں کھلم کھلا لعنت بھیجی گئی اور امن کی صبحِ نو کی بشارت دی گئی تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب کو حبشہ والوں سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ شہنشاہ ہیل سلاسی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ شہنشاہ نے اُنہیں دِنوں مجلس اقوام کے اجلاس میں ایک ولولہ خیز تقریر کی تھی اور مغربی طاقتوں کو فاشزم کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ حبشہ کے میدانِ جنگ میں ہماری قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے تو یہ تمھاری بھول ہے، وہاں دراصل تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب کو یہ تقریر بہت پسند آئی تھی۔ ایک دن میں نے اور اختر حسین نے حبشہ پر ایک کتاب مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا مگر سوال اس کی طباعت اور اشاعت کا تھا۔ ہم لوگوں نے اس منصوبے کا ذکر مولوی صاحب سے کیا تو انہوں نے ہماری ہمت بندھائی اور کہنے لگے تم لوگ لکھو، میں اسے انجمن کی طرف سے چھاپوں گا، چنانچہ ہم دونوں نے حبشہ پر جو کچھ مسالہ مل سکتا تھا جلدی جلدی جمع کیا اور ایک مہینے کے اندر مسودہ مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور یہ کتاب ''جنگِ حبشہ واطالیہ'' کے نام سے شائع ہوگئی۔ غالباً انجمن کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہوگا کہ دورِ حاضر کے ایک خالص سیاسی موضوع پر انجمن کی طرف سے کوئی کتاب شائع ہوئی ہو۔

مولوی صاحب اور قاضی صاحب میں بڑی خوبی یہ تھی کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں وہ بالکل بخل نہ کرتے تھے اور نہ نئے خیالات سے گھبراتے تھے۔ کوئی ادبی یا علمی تجویز ان کے پاس لے کر جاؤ تو وہ باتیں بڑے غور سے سنتے تھے، مشورے دیتے تھے اور ہمت بڑھاتے تھے اور اگر مالی امداد کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ایسے کاموں میں وہ سیاسی مصلحتوں کی بھی پروا نہ کرتے تھے بشرطیکہ انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ تجویز پیش کرنے والے مخلص ہیں اور ان کے کاموں سے ادب کو فروغ ہوگا۔

مولوی صاحب اور قاضی صاحب نے اسی جذبے کے تحت ہمیشہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا ساتھ دیا۔

ایک دن ڈاکٹر یوسف حسین خاں، قاضی صاحب سے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ سجاد ظہیر کا خط آیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ حیدر آباد میں بھی قائم کی جائے مگر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں اس تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور نظام الملک آصف جاہ پر یا آصف جاہی خاندان پر کوئی کتاب مرتب کرنے کے لیے اُن کو حکومت کی طرف سے وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ نواب اعظم جاہ کے دربار میں بھی اُن کا بہت آنا جانا تھا۔ اتفاق سے سجاد ظہیر سے میری بھی خط و کتابت تھی۔ میں نے انہیں ڈاکٹر صاحب کے مشاغل سے آگاہ کر دیا اور لکھا کہ حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں میں ڈاکٹر یوسف کی ترقی پسندی مشکوک ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں ڈاکٹر یوسف کو پیرس سے جانتا ہوں، اُس وقت تو بہت روشن خیال اور ترقی پسند بنتے تھے لیکن حیدر آباد کے حالات کا مجھے علم نہیں ہے تم لوگ جو چاہے کرو۔ مجھے منظور ہو گا۔ اب ہم لوگوں نے اُن ادیبوں کی ایک فہرست بنائی جن کو ہم ترقی پسند خیال کرتے تھے۔ قاضی صاحب سے باتیں کیں۔ وہ فوراً راضی ہو گئے بلکہ انہوں نے ترقی پسند ادب کی حمایت میں ایک اداریہ بھی پیام میں لکھا اور اس تحریک کے بارے میں برطانوی ہند کے نیم سرکاری انگریزی اخبار جو غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے ان کی بھی تردید کی۔ اُنہیں نے ہمیں مسز سروجنی نائیڈو سے ملنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر مسز نائیڈو سرپرستی قبول کر لیں تو تمہاری انجمن کا وقار بہت بڑھ جائے گا اور حکومت بھی تم لوگوں کو تنگ نہ کرے گی۔ مسز نائیڈو انگریزی کی مشہور شاعر اور مقرر تھیں۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں لیکن حیدر آباد کی سیاست میں بالکل حصہ نہیں لیتی تھیں۔ لطف یہ ہے کہ وہاں کے نیشنلسٹ حلقے کے

بجائے اُن کا ربط ضبط عمائدین ریاست سے تھا اور سرکاری حلقوں میں اُن کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ مسز نائیڈو کے بڑے لڑکے ڈاکٹر جیسوریا نائیڈو قاضی صاحب کے پاس اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ جیسوریا نے کئی بار کہا بھی کہ چل کر ممی سے مِل لو لیکن میری جرأت نہ ہوئی۔ قاضی صاحب کی بھی مسز نائیڈو کے گھر آمدورفت تھی لیکن میں کبھی اُن کے ساتھ مسز نائیڈو کے گھر نہ گیا۔ مگر اب ترقی پسند ادب کی تحریک کا معاملہ تھا لہٰذا ہم لوگوں نے قاضی صاحب سے درخواست کی آپ ہمیں مسز نائیڈو سے ملا دیں۔ چنانچہ قاضی صاحب مجھے اور مخدوم کو مسز نائیڈو کے پاس لے گئے۔ مخدوم کا تعارف ہوا تو کہنے لگیں میں تمہارے شعر سن چکی ہوں۔ بہت اچھا کہتے ہو اور بی بی کہتی ہے کہ تم پڑھتے بھی بہت اچھا ہو۔ سناؤ شعر۔ میری باری آئی تو بولیں کہ میں "پیام" نہیں پڑھتی لیکن بی بی تمہارے مضمونوں کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ وہ تم سے مِلنا بھی چاہتی ہے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے آواز دی۔ "ارے کوئی ہے۔ ذرا بی بی کو تو بلاؤ"، وہ بے تکان بولتی چلی جاتی تھیں اور ہم لوگوں کو اپنی بات کہنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میں اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ ہم لوگوں کی قدردان یہ بی بی کون بزرگ ہیں جن کا بار بار ذکر ہو رہا ہے۔ اتنے میں سانولے رنگ کی گداز بدن کی ایک خاتون بڑے وقار سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئیں اور قاضی صاحب سے بغل گیر ہو گئیں۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ یہ مسز نائیڈو کی چھوٹی صاحبزادی مس پدما جانائیڈو ہیں۔ بڑے اخلاق سے مِلیں اور بہت جلد بے تکلف ہو گئیں۔ مسز نائیڈو قاضی صاحب سے ڈاکٹر انصاری کے بارے میں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے موقع پاکر آہستہ سے پدما جا سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ آپ سفارش کر دیں تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پدما جا نے کہا "ٹھہرو" اور پھر مسز نائیڈو کی بات کاٹ کر بولیں کہ "ممی آپ بولے چلی جاتی ہیں کسی کی سُنتی ہی نہیں۔ یہ لڑکے بے چارے آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" مسز نائیڈو بولیں، ہاں ہاں کہیں۔ میں نے ان کو کب منع کیا ہے۔ ہاں بھائی

کیا بات ہے کہو۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔ قاضی صاحب نے پُرزور الفاظ میں ہماری وکالت کی اور پدما جا نے سفارش کا مشرقی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ "ممی یہ سب بنّے کے دوست ہیں۔ مُنّے کے چھوٹے بھائی کے۔" "کون مُنّے؟ سعیدہ کے میاں؟" مسز نائیڈو نے پوچھا۔ "ہاں سعیدہ کے میاں۔" پدما جا نے جواب دیا۔ تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا، معلوم ہوا کہ مُنّے بنّے یعنی سجاد ظہیر کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر تھے اور سعیدہ اُن کی بیوی کا نام تھا جو نواب علی یاور جنگ کی سگی بہن تھیں۔ اس رشتے سے ترقی پسند ادب کی تحریک کا دکن پر پورا پورا حق قائم ہو گیا اور مشرقی تہذیب کا وہ پیکرِ مجسم اس استحقاق سے انکار نہ کر سکا۔ مسز نائیڈو ہماری انجمن کی سرپرست بن گئیں۔ چنانچہ انجمن کا پہلا اجلاس مسز نائیڈو کی کوٹھی ہی میں ہوا۔

لیکن زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ یہ تحریک مسز نائیڈو کی کوٹھی سے پیدل باہر نکلی اور حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں میں گھل مل گئی۔ مخدوم، ظفر، ابراہیم جلیس، سلیمان ادیب، نظر حیدر آبادی اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مسز سروجنی نائیڈو عجب باغ و بہار خاتون تھیں۔ اُن کا تعلق بنگال کے ایک روشن خیال خاندان سے تھا۔ اُن کے والد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیا ۱۹ویں صدی کے اواخر میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ مسز نائیڈو کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں اور سب ایک سے ایک بڑھ کر ذہین۔ اُن کے بھائی وریندر ناتھ چٹوپادھیائے۔ اے کر کے ولایت بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے لندن گئے مگر وہاں ہندوستانیوں کے انقلابی گروہ میں شامل ہو گئے۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل جب ہندوستانی انقلابیوں نے برلن کو اپنا مستقر بنایا تو وریندر ناتھ بھی برلن منتقل ہو گئے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے انقلاب روس سے قبل ہی روسی کمیونسٹوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اُن کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ماسکو میں ہوا۔ وہ وطن کبھی واپس نہ آئے۔ اُن کے دوسرے بھائی مشہور شاعر، ڈرامہ نویس اور

اداکار ہیرندر ناتھ چٹوپادھیہ تھے۔

مسز سروجنی نائیڈو نے بھی ولایت میں تعلیم پائی تھی اور انگریزی میں شعر کہتی تھیں۔ اُن کی شاعری اور خطابت کے اعتراف میں قوم نے اُن کو بُلبلِ ہند کا خطاب دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ان جیسی لائق، طبّاع عورتیں ملک میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملتیں۔ آزادی کی تحریک میں شریک ہو کر جب اُنہوں نے سیاسی تقریریں شروع کیں تو اُن کی شہرت کو اور چار چاند لگ گئے۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جو کانگرس کی صدر منتخب ہوئیں اور اُس وقت بھی کانگرس کی مجلس عاملہ کی رُکن تھیں۔

جوانی کا حال تو معلوم نہیں البتہ اُن کو جب ہم نے دیکھا تو حُسنِ صورت کے کوئی آثار باقی نہ تھے۔ ڈھلکتا ہوا سانولا رنگ، چھوٹا قد، بھاری جسم اور ناک نقشہ بھی بس واجبی واجبی سا۔ اُن کی شادی حیدر آباد کے ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر میجر نائیڈو سے ہوئی تھی۔ اُن کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے ڈاکٹر جیسوریا نائیڈو اپنی یورپین بیوی کے ساتھ الگ رہتے تھے۔ چھوٹا بیٹا سخت ناکارہ تھا جو مانگے تانگے کی شراب کی تلاش میں دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ بڑی بیٹی مس لیلامنی نائیڈو آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ تھیں اور پڑھنے پڑھانے کے سوا اُن کو اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھا، البتہ مس پدماجا نائیڈو کو ماں کے بہت سے اوصاف ورثے میں ملے تھے۔

سروجنی نائیڈو بڑی مجلسی، ہنس مکھ اور ملنسار خاتون تھیں۔ مذہب و ملّت کے تعصبات سے پاک، ادب اور فن کی دلدادہ، خوش مذاق، خوش گفتار، خوش مزاج اور خوش پوشاک۔ اُن کی محفل میں حیدر آباد کے نواب، جاگیردار، اعلیٰ حکام، وکیل، ادیب، صحافی اور سیاست دان سب ہی خوشی خوشی شریک ہوتے تھے اور خوش خوش واپس جاتے تھے۔ وہ سب سے بڑی گرمجوشی سے ملتی تھیں۔

بُلبلِ ہند، ہر چند کہ کانگرس کی صفِ اوّل کی راہنما تھیں اور حیدر آباد سے باہر

خوب چمکتی تھیں لیکن وہ حیدر آباد کے کسی سیاسی مسئلے میں کبھی نہ دخل دیتی تھیں نہ حیدر آباد کے بارے میں کبھی اظہار خیال کرتی تھیں۔ میں نے اُن کو حیدر آباد میں فقط ایک بار جلسہ عام میں تقریر کرتے سُنا، وہ بھی فنونِ لطیفہ پر۔ اُس سے پیشتر اُن کی شعلہ بیانی کا ایک منظر بمبئی میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں اُس وقت دیکھنے میں آیا تھا جب شریمتی کملادیوی چٹوپادھیہ نے سوشلزم کی حمایت میں ایک تجویز پیش کی تھی۔ کملادیوی مسز نائیڈو کے بھائی ہریندر ناتھ چٹوپادھیہ کی سابقہ بیوی تھیں۔ بلا کی حسین اور بہت اچھی مقرر۔ اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا، تب کانگرس ہائی کمان کی طرف سے مسز نائیڈو تجویز کی مخالفت کرنے کھڑی ہوئیں۔ اُن کی دلیلیں تو بالکل بچکانہ تھیں مگر ان کی بھاری بھرکم شخصیت اور جذباتی خطابت نے، جس کو نند بھاوج کی خاندانی دشمنی نے دو آتشہ کر دیا تھا کملادیوی کے حسن و شباب کا سارا طلسم درہم برہم کر دیا۔ پنڈال دوبارہ تالیوں سے گونج اٹھا اور کملادیوی کی تجویز مسترد ہو گئی۔

لیکن حیدر آباد کے جلسے میں کسی حریف سے مقابلہ نہ تھا بلکہ مسز نائیڈو اپنے منھ بولے بیٹے ڈاکٹر حسین شاہد سہروردی کو متعارف کرنے تشریف لائی تھیں۔ ڈاکٹر شاہد سہروردی آرٹ پر کئی کتابوں کے مصنف تھے اور آرٹ پر اتھارٹی مانے جاتے تھے (تقسیمِ ہند کے بعد وہ کچھ عرصہ اسپین میں پاکستان کے سفیر رہے) مسز نائیڈو نے اُن کی ثنا و صفت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے اور آرٹ پر ایسی پیاری تقریر کی کہ بعد میں بے چارے شاہد سہروردی صاحب کا رنگ ہی نہ جم سکا۔

مسز سروجنی نائیڈو سوشلسٹ نہ تھیں مگر اُن کی انسان دوستی اور دردمندی کے سوشلسٹ غیر سوشلسٹ سب قائل تھے۔ ہم نے "آزادی کی نظمیں" کے عنوان سے غالب سے دورِ حاضر تک کے شاعروں کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا اور رام گڑھ (بہار) لے گئے جہاں ایک دور اُفتادہ دیہات میں کانگرس کا سالانہ اجلاس مولانا آزاد کی

صدارت میں منعقد ہو رہا تھا۔ میں ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ ٹھہرا جو میرے ہم وطن اور پرانے کرم فرما تھے۔ پاس ہی مسز نائیڈو کی قیام گاہ تھی۔ میں نے کتاب اُن کو پیش کی تو فرمانے لگیں تم حیدر آباد سے اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے حالات بیان کیے تو ہنس کر بولیں، مجھ کو معلوم ہے تم سوشلسٹ لوگ کانگرس میں گھس کر گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہو۔ پھر بٹوے سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ مجھ کو دینے لگیں تو میں نے کہا، میڈم میں نے یہ کتاب آپ کو نذر کی ہے۔ بولیں کوئی بات نہیں۔ بڑوں سے جو ہاتھ آجائے اُس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ اور کاپیاں بھی لائے ہو تو یہاں رکھ جاؤ، میں بیچ دوں گی۔ اتنے میں آصف علی صاحب آگئے۔ ان سے میرا تعارف کروایا اور کتاب اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں، دیکھو کتنے کام کی چیز ہے۔ آصف علی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ پھر بولے، میاں آپ نے ہمارے شہر کے ایک شاعر کو تو نظر انداز کر دیا۔ میں نے پوچھا جناب کس شاعر کو، بولے بہادر شاہ ظفؔر کو۔ پھر انہوں نے بہادر شاہ ظفؔر کی چار پانچ سیاسی ہولیاں وہیں کھڑے کھڑے سنا دیں اور ظفؔر کے سیاسی کلام پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی وقت اُن سے مل کر یہ ہولیاں نقل کر لوں گا لیکن بارش اور طوفان کی وجہ سے دوسرے دن وہاں ایسی بھگدڑ مچی کہ آصف علی صاحب سے ملاقات کا موقع ہی نہ مل سکا۔ مجھ کو ان ہولیوں کے تلف ہو جانے کا آج تک افسوس ہے۔

دوسرے دن روانگی سے پہلے مسز نائیڈو سے ملنے گیا تو وہ موجود نہ تھیں البتہ بی بی (پدما جا) تھیں۔ کہنے لگیں ممی نے تمہاری سب کتابیں بکوا دی ہیں۔ یہ لو ان کے دام اور کہا ہے کہ اور ہوں تو لا کر رکھ جاؤ۔

سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کے بعد ہم لوگوں نے لکھنؤ میں "محبانِ سوویت یونین" کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی اور اُس کی کانفرنس کرنے والے تھے۔ تجویز ہوئی کہ صدارت پنڈت جواہر لال نہرو سے کروائی جائے اور افتتاح مسز نائیڈو سے۔ میں

پنڈت نہرو کو دعوت دینے الٰہ آباد گیا تو آنند بھون میں اتفاق سے پدما جا سے ملاقات ہوئی جو وہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اُن سے سب ماجرا بیان کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ممّی کو میں راضی کرلوں گی تم فکر نہ کرو، البتہ پنڈت جی سے تم خود بات کرلو۔ اُن سے ملا تو کہنے لگے، تم ٹھہرو میں مولانا آزاد کو اسٹیشن پہنچا کر ابھی لوٹتا ہوں تو باتیں ہوں گی۔ یہ گفتگو باہر برآمدے میں ہورہی تھیں، اتنے میں مولانا آزاد اندر سے برآمد ہوئے موٹر برساتی میں کھڑی تھی۔ پنڈت جی نے دروازہ کھولا۔ مولانا اندر بیٹھے اور پنڈت جی بھی بیٹھنے والے ہی تھے کہ مولانا نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جواہر ٹوپی اوڑھ کر آؤ۔" اور پنڈت جی معافی مانگتے ہوئے اندر بھاگے۔

محبانِ سوویت کا جلسۂ عام امین آباد پارک میں ہوا۔ ۱۵، ۲۰ ہزار کا مجمع تھا جس سے پنڈت نہرو نے بھی خطاب کیا اور مسز نائیڈو نے بھی۔

مسز نائیڈو کے آخری درشن ۱۹۴۴ء میں ہوئے۔ وہ کچھ دن پہلے رہا ہو کر آئی تھیں اور بمبئی میں مشہور تھیافسٹ کارکن مسز صوفیا واڈیا کی کوٹھی میں مقیم تھیں۔ تحریکِ پاکستان کی حمایت کرنے کے سبب سے اُن دِنوں کمیونسٹ پارٹی کے تعلقات کانگریس سے بے حد کشیدہ تھے لیکن مسز نائیڈو اُسی محبت اور شفقت سے ملیں جو اُن کا شیوہ تھا۔ اب نہ مسز نائیڈو زندہ ہیں نہ اُن کے خاندان کے دوسرے افراد بس اُن کی یادیں باقی ہیں اور ہم یہ کہہ کر دِل کو تسلّی دیتے ہیں کہ۔

گماں مبر کہ چوں تو بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بہ کشتند و انجمن باقی ست

۱۹۸۰ء میں ۳۵ برس بعد حیدر آباد جانا ہوا تو مسز نائیڈو بہت یاد آئیں۔ ایک روز نرسنگھ راؤ ہم کو کہیں لے جارہے تھے۔ اُن کی بیٹی جو حیدر آباد یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں (یہ یونیورسٹی آزادی کے بعد قائم ہوئی تھی) ساتھ تھی۔ اُس نے دفعتاً ایک عمارت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''انکل، دیکھیے، وہ رہی ہماری یونیورسٹی'' میں نے مڑ
دیکھا تو وہ بولی۔ ''آپ نے اس بلڈنگ کو پہچانا نہیں۔ مسز نائیڈو کی کوٹھی ''گولڈ
تھریشولڈ'' یہی تو ہے۔ اِس کو انہوں نے ریاست کو نذر کر دیا تھا مگر آپ کو یہ سن
افسوس ہوگا کہ ہماری لائبریری میں جو اسی بلڈنگ میں واقع ہے مسز نائیڈو کی ایک تصنیف
بھی موجود نہیں۔'' نرسنگھ نے جل کر کہا: ''ہم اپنے تہذیبی ورثوں کو چھپا کر رکھتے ہیں
تاکہ کسی کی نظر نہ لگے۔''

ہوشیار خبردار

والیانِ ریاست میں جہاں اور بہت سے اوصافِ حسنہ تھے وہاں ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ افرنگیوں کے روبرُو بھیگی بلّی بن جاتے تھے البتہ اپنی رعایا کے سامنے شیرِ نیستاں کے روپ میں ظاہر ہوتے تھے تاکہ رعایا ان کے رعب اور خوف سے لرزتی رہے۔ پاکستان میں تو خیر سے ہمارے کان ہوشیار خبردار اور باادب باملاحظہ کی آوازوں اور سیٹیوں کے شور کے عادی ہو چکے ہیں لیکن پہلی بار یہ ذہنی کوفت بلکہ انسانیت کی توہین حیدر آباد میں برداشت کرنی پڑی۔ مجھے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ حیدر آباد کی مشہور سڑک عابد روڈ پر دفعتاً سیٹیاں بجنے لگیں اور سڑک پر ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ تانگے اور موٹریں تیزی سے آس پاس کے گلی کوچوں میں مڑ گئیں۔ راہ گیر بھاگ کر دکانوں میں گھس گئے یا جہاں کھڑے تھے وہیں نقشِ دیوار بن گئے اور میرے دیکھتے دیکھتے پوری سڑک حدِ نظر تک سنسان ہو گئی۔ ہر طرف موت کا سا سناٹا تھا، ہر شخص کے چہرے پر دہشت اور گھبراہٹ تھی۔ تقریباً بیس منٹ تک آمد و رفت رُکی رہی کیونکہ اعلیٰ حضرت شہریار دکن کی سواری وہاں سے گزرنے والی تھی۔ بارے خدا خدا کر کے ایک موٹر نظر آئی جو قانون

کے خلاف سڑک کے دائیں جانب چل رہی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت تقریباً ہر روز اسی وقت اپنی والدہ کو سلام کرنے جاتے ہیں جو موسیٰ ندی کے اس پار پرانے شہر میں رہتی تھیں۔

پرانا شہر یعنی سلطان قلی قطب شاہ کا حیدر آباد ندی کے اُس جانب آباد تھا۔ قلی قطب شاہ اپنی محبوبہ بھاگ متی سے ملنے دریا عبور کر کے جاتا تھا اور اُس نے عہد کیا تھا کہ تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اس دریا پر پل بنواؤں گا تاکہ گولکنڈہ اور بھاگ نگر کے درمیان آمد و رفت آسان ہو جائے۔ چار مینار، چار کمان، مکّہ مسجد، فلک نما، سٹی کالج، ہائی کورٹ غرض کہ حیدر آباد کی تمام تاریخی عمارتیں پرانے شہر ہی میں ہیں۔ آصف جاہیوں کے آبائی محل اور مقبرے بھی وہیں ہیں البتہ نظام اور اُن کی اولاد نئے شہر میں سکونت پذیر تھی۔

نظام تو شاید دن میں فقط ایک بار محل سے نکلتے تھے لیکن بادشاہ بیگم کا زیادہ وقت سڑکوں پر ہی گزرتا تھا۔ حیدر آباد میں انہیں سب دُلہن پاشا کہتے تھے۔ وہ عدن باغ نام کی ایک کوٹھی میں اکیلی رہتی تھیں اور لوگ نظام سے زیادہ ان محترمہ سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ خاصی تند مزاج واقع ہوئی تھیں۔ ان کا جب جی چاہتا گھومنے نکل پڑتیں۔ اس میں نہ وقت کی قید تھی اور نہ کوئی راہ متعین تھی۔ مشکل یہ تھی کہ پولیس والوں کو نظام کی طرح دلہن پاشا کے لیے بھی ہٹو بچو کرنا پڑتا تھا حالانکہ ان موصوفہ کو ان انتظامات کی ضرورت تھی نہ پروا۔ دکان دار دعا مانگتے تھے کہ خدایا کالے چور سے واسطہ پڑے لیکن دلہن پاشا سے واسطہ نہ پڑے کیونکہ وہ جس دکان میں جی چاہتا گھس جاتیں اور جو سامان پسند آتا بندھوالے جاتیں۔ دلہن پاشا کو یاد بھی نہ رہتا کہ انہوں نے کوئی خریداری کی تھی لیکن ڈیوڑھی کا داروغہ بعد میں سارا سامان دکانوں کو واپس بھجوا دیتا تھا۔

سنتے ہیں کہ اُن کا غصہ بھی غضب الٰہی سے کم نہ تھا، خود اعلیٰ حضرت اُن سے بہت

ڈرتے تھے۔ یوں تو وہ کنگ کوٹھی کے اندر قدم نہیں رکھتی تھیں کیونکہ وہاں اُن دنوں شہر گلبرگہ کی ایک خاتون نظام کی نورِ نظر بنی ہوئی تھیں البتہ نظام سے جب بہت خفا ہوتیں تو کنگ کوٹھی میں گھس جاتیں۔ نظام صاحب کو خبر ہوتی تو وہ بھی بالاخانے سے نیچے صحن میں تشریف لاتے۔ حکم ہوتا کہ میرے جہیز کا سارا سامان نکلواؤ۔ نظام ان کے مزاج سے واقف تھے۔ دلہن پاشا کے لیے کرسی منگواتے۔ چوبداروں کو حکم دیتے کہ توشے خانے سے پاشا کا جہیز نکالا جائے۔ بادشاہ بیگم وہیں صحن میں کرسی پر بیٹھ جاتیں اور توشے خانے کا سامان نکل نکل کر ان کے سامنے ڈھیر ہونے لگتا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہتیں مگر سیماب صفت طبیعت میں قرار کہاں۔ دفعتاً اُٹھ کھڑی ہوتیں اور کچھ کہے سُنے بغیر رخصت ہو جاتیں۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد یہ سارا سامان دوبارہ توشے خانے میں بند کر دیا جاتا اور بات آئی گئی ہوتی۔ یہ ڈرامہ اکثر کنگ کوٹھی کے بڑے صحن میں اِسی سازوسامان سے کھیلا جاتا تھا۔ یہ بات آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ سنی سنائی ہے۔

ہم نے محترمہ کو یوں تو متعدد بار موٹر میں گزرتے دیکھا تھا لیکن دُوبدو مشاہدے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی، البتہ ایک روز شام کے وقت ہم لوگ نظام ساگر سیر کو گئے ہوئے تھے جو شہر سے کچھ فاصلے پر نہایت پُر فضا جگہ ہے۔ وہاں جھیل کے کنارے ایک خوبصورت پارک ہے اور جھیل کے بند پر کئی میل لمبی سڑک بنی ہوئی ہے۔ ہم لوگ بند کے ایک سرے پر کھڑے تھے کہ اتنے میں علیہ حضرت کی سواری ہمارے پاس سے زن سے گزر گئی۔ علیہ حضرت جو نہایت مختصر سی دُبلی پتلی خاتون تھیں موٹر کی پچھلی سیٹ پر تنہا تشریف فرما تھیں، البتہ ڈرائیور کے پہلو میں ایک مسلح سپاہی بیٹھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد موٹر واپس لوٹا اور ہمارے قریب پہنچ کر دفعتاً رُک گیا۔ ہم لوگوں کے تو اوسان خطا ہو گئے کہ اب ضرور کوئی آفت آئی۔ ہم نے جھک کر سلام کیا تو دلہن پاشا نہایت شفقت سے نرم لہجے میں بولیں کہ میاں یہاں نہیں کھڑے ہوتے۔ مطلب یہ تھا کہ جب ہماری

سواری گزرے تو سڑک سے ہٹ جانا چاہیے مگر قبل اس کے کہ ہم معذرت کرتے یا معافی مانگتے موٹر روانہ ہو چکا تھا۔

آصف جاہی خاندان کا ایک واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ ان دنوں نظام کے محل کنگ کوٹھی کے پاس سے ایک پگڈنڈی حیدر گوڑے نام کے ایک محلے کی طرف جاتی تھی۔ میں اکثر اسی پگڈنڈی سے عابد روڈ آتا جاتا تھا۔ راستے میں ایک کوٹھی تھی جس میں نظام کے پانچ چھ بیٹے رہتے تھے۔ اسکول جانا تو درکنار ان کو کوٹھی سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ دن بھر وہ کوٹھی میں پڑے رہتے البتہ شام کے وقت کنگ کوٹھی سے کھلی چھت کی ایک موٹر آتی اور ان لڑکوں کو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لیے سیر کو لے جاتی۔ ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے ان لڑکوں کو کئی بار چہار دیواری کے اوپر بیٹھے دیکھا تھا اور کترا کر چلا گیا تھا۔ ایک دن میں اُدھر سے جا رہا تھا کہ یہ لڑکے مجھے دور سے نظر آئے، وہ دیوار پر بیٹھے ہوئے ایک خونچہ فروش سے چنا جور گرم لے کر کھا رہے تھے۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں تاکہ میری وجہ سے ان کے شغل میں خلل نہ پڑے۔ اتنے میں ایک لڑکے نے آواز دی کہ ذرا سنیے گا۔ میں گھبرایا کہ مبادا اُن کو میرا اُدھر سے گزرنا ناگوار ہوا اور اب ضرور کوئی آفت آئے گی۔ بہر حال میں دیوار کے قریب گیا اور بولا کہ فرمایئے کیا حکم ہے۔ لڑکوں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ آپ کی جیب میں کچھ پیسے ہوں تو ہمیں دے دیجیے۔ چنے والے کو دینا ہے۔ یہ الفاظ سن کر میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آ گیا۔ بہر حال میں نے جیب میں جو آٹھ دس آنے تھے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ان کے حوالے کیے اور چلتا بنا۔ گھر پہنچ کر قاضی صاحب سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہیں مطلق حیرت نہ ہوئی۔ کہنے لگے شادی سے پہلے نواب اعظم جاہ اور نواب معظم جاہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ تو کہیے کہ وائسرائے نے ان کی درخواست پر نظام سے سفارش کی تب ان کے وظیفے مقرر ہوئے جس کے بعد یہ دونوں بھائی عالیشان کوٹھیوں میں رہنے اور

روپیہ پانی کی طرح بہانے لگے۔ اِن کو حکومت کی طرف سے ہزاروں روپیہ وظیفہ ملتا تھا پھر بھی لاکھوں کے مقروض تھے۔

نظام شعر کہتے تھے اور حصولِ دولت کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے۔ شاعری کی صلاحیت نہ جانے وہبی تھی یا کسبی البتہ وہ ایک زمانے سے اُردو، فارسی میں غزلیں لکھتے چلے آرہے تھے پھر بھی آج تک ڈھنگ کا ایک بھی شعر ان کے قلم سے نہیں نکلا۔ ان کی غزلیں اخبار "رہبر دکن" اور "صبحِ دکن" میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ اخبار "پیام" سے خوش نہ تھے۔ نہ پیام پڑھتے تھے اور نہ اپنی غزلیں پیام میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، البتہ ہوش بلگرامی جو قاضی صاحب کے دوست تھے دربار میں موقع بے موقع "پیام" کا ذکر چھیڑ دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی قاضی صاحب کی نثر نگاری کی تعریف بھی کر دیتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد نظام نے اخبار پیام پڑھنا شروع کیا اور بالآخر ایک دن اعلیٰ حضرت کی ایک غزل "پیام" میں چھپنے کے لیے نازل ہو گئی۔

نظام کا طریقہ یہ تھا کہ غزل اپنے کاتب سے خوش خط لکھواتے تھے۔ اشعار کے درمیان کافی جگہ ہوتی تھی اور اس خالی جگہ میں جابجا "رائے استاد" لکھی جاتی تھی۔ نہ جانے رائے واقعی ان کے اُستاد جلیلؔ (نواب فصاحت جنگ) کی ہوتی تھی یا نظام ان کی جانب سے خود ہی اظہارِ رائے فرمادیتے تھے۔ بہر حال کہیں "سبحان اللہ کیا شعر ہے۔" لکھا ہوتا، کہیں "بہ بہ چہ خوب است" اور کہیں "واہ واہ اس شعر کا جواب نہیں ہوسکتا۔" غرضیکہ ہر غزل میں تین چار اشعار کے نیچے یا بالکل آخر میں اسی قسم کے توصیفی کلمات درج ہوتے تھے اور اخباروں کو ہدایت تھی کہ پوری غزل مع "رائے استاد جلیل" من و عن شائع کی جائے۔ کوئی شخص اعراب تک میں اصلاح کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی غزلیں عام طور پر آٹھ دس شعر کی ہوتی تھیں اور جب کتابت مکمل ہو جاتی تو پروف ریڈر سے ایڈیٹر تک ہر شخص اسے بڑے غور اور احتیاط سے پڑھتا تھا تاکہ کتابت کی کوئی غلطی نہ

رہ جائے۔ لطف یہ ہے کہ پیکِ شاہی نو دس بجے رات سے پہلے کبھی نہ آتا تھا۔ اس کے آنے کی اطلاع بھی پہلے سے نہیں ہوتی۔ ڈیوڑھی کا داروغہ بھی نہ جانتا تھا کہ شاہی غزل کب وارد ہو گی اور کس اخبار کو اس کی اشاعت کا شرف بخشا جائے گا۔ دن، تاریخ کا فیصلہ بھی خود نظام کرتے تھے، وہ بھی کافی رات گئے۔

شاہی غزل کے شائع کرنے میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔ پہلے صفحے کے اشتہاروں کا خسارہ، خبروں کا خسارہ، کاغذ کا خسارہ، وقت کا خسارہ اور رات کی نیند کا خسارہ۔ جس روز غزل آتی تھی ہم لوگ دو بجے سے پہلے سو نہ سکتے تھے اور سوتے بھی تو اس خوف سے نیند پریشان رہتی تھی کہ مبادا کتابت کی کوئی غلطی ہو گئی ہو یا پہلے صفحے پر کوئی داغ دھبہ آ گیا ہو تو صبح شامت آ جائے گی۔ نظام کے درباری قدرتی طور پر ان کی شاعری کی مدح و ثنا کرتے رہتے تھے اور کم از کم نظام کے روبرو تعریف کے پُل باندھتے رہتے تھے لیکن غضب یہ ہوا کہ خوشامدیوں نے نظام کی خوشنودی حاصل کرنے اور مولوی عبدالحق کو زِچ کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ اعلیٰ حضرت کا کلام کیوں نہ عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دیا جائے، چنانچہ نظام نے فرمان بھی جاری کر دیا۔ اب کس کی مجال تھی جو تعمیل نہ کرتا۔ نظام مولوی عبدالحق کو خبطی مولوی کہا کرتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف تھے۔ یہ تجویز مولوی صاحب کے لیے کافی پریشانی کا باعث بنی۔ مسئلہ نازک تھا۔ مولوی صاحب مخالفت کرتے ہیں تو نظام خفا ہوتے ہیں، حمایت کرتے ہیں تو جگ ہنسائی ہوتی ہے لیکن مولوی صاحب نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے۔ مناسب موقعے پر معروضہ گزارا کہ باریاب ہونا چاہتا ہوں۔ طلبی ہوئی۔ کنگ کوٹھی پہنچے اور دربار میں حاضر ہوئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ نواب منظور جنگ، ہوش بلگرامی، نواب زین یار جنگ اور دوسرے مصاحبین دست بستہ کھڑے ہیں۔ نظام ایک ٹوٹی کرسی پر بیٹھے ہیں اور چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہیں۔ نظام کسی کو بیٹھنے کی

اجازت نہیں دیتے تھے لہٰذا وہاں کوئی دوسری کرسی بھی نہیں تھی۔ مولوی صاحب نے کورنش عرض کی تو نظام کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر شاید انہیں اپنا فرمان یاد آ گیا۔ کہنے لگے مولوی تم نے ہمارا فرمان پڑھا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ کلام الملوک ملوک الکلام ہوتا ہے۔ فدوی کے لیے اس سے بڑھ کر عزت اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیر و مرشد کا کلام پڑھنے کی سعادت حاصل کرے مگر حق بات یہ ہے کہ کلامِ فیض التیام کو پوری طرح سمجھنے اور پھر طالب علموں کو سمجھانے کے لیے جس تبحر علمی اور دانش وری کی ضرورت ہے وہ اس ناچیز میں نہیں ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ حاضر ہو کر عرض کروں کہ بندگانِ اقدس اپنے کلامِ بلاغت نظام کے نکاتِ عالیہ بہ نفسِ نفیس اس فدوی کو سمجھائیں مگر ہمت نہ ہوئی کہ سرکار کے سمجھانے کے باوجود عقل میں نہ آئے تو کیا ہو گا؟

سرکار نے ہوش کو مخاطب کر کے فرمایا: "سنا ہوش کیا کہہ رہے ہیں یہ؟" ہوش نے آگے بڑھ کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا: "پیر و مرشد۔ معروضہ غور طلب ہے۔ کلام الملوک واقعی ملوک الکلام ہے، اس کو سمجھانا کوئی آسان بات نہیں۔" "تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" سرکار نے کہا۔ "کلام جب اُستاد کی سمجھ سے بالا ہو تو وہ لڑکوں کو کیا خاک سمجھائے گا۔ ٹھیک ہے۔ بالکل مناسب ہے۔" ہوش بلگرامی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ جامعہ میں کب تک ایسے اُستاد جمع ہو جائیں گے جو میرا کلام سمجھ کر...... تم سمجھے میں کیا کہہ رہا ہوں...... میرا کلام خود اچھی طرح سمجھ کر لڑکوں کو سمجھا سکیں؟ ہوش؟"

ہوش: "جی پیر و مرشد۔"

سرکار: "تمہارا کیا خیال ہے۔ کتنی مدت لگے گی میرا کلام سمجھنے میں؟"

ہوش: "سرکار مدت کا انحصار کلام پر نہیں ہے بلکہ سمجھنے والے کی عقل پر ہے۔"

سرکار: ''ٹھیک کہتے ہو۔ دار و مدار عقل پر ہے۔ میں شعر دے سکتا ہوں عقل تو نہیں دے سکتا۔ اچھا میں کل دوسرا فرمان جاری کردوں گا۔ فی الحال کلام کی تدریس روک دی جائے صرف تفہیم کا کام جاری رہے اور بس، کیا سمجھے؟''

اس طرح مولوی صاحب نے جامعہ عثمانیہ کو اعلیٰ حضرت کے کلام سے بچالیا۔

نظام کی کنجوسی کے قصے حیدر آباد کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ جن دِنوں میں ویکاجی ہوٹل میں رہتا تھا تو ایک روز میں نے دیکھا کہ چار پانچ بہلیاں اندر چلی آرہی ہیں۔ بہلیوں پر سرخ پردے پڑے ہوئے تھے اور ہر بہلی کے ہمراہ ایک چوبدار بھی تھا۔ میں نے ان بہلیوں کو کنگ کوٹھی سے نکلتے کئی بار دیکھا تھا۔ یہ بہلیاں دراصل شاہی محرمات کے استعمال میں آتی تھیں کیونکہ کنگ کوٹھی کی بیگمات کو موٹر استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نظام کی صاحبزادیاں اوّلاً تو محل کے باہر نہ نکلتی تھیں اور کہیں جاتی بھی تھیں تو نظام کے ہمراہ۔ نظام جب حیدر آباد سے باہر کہیں سفر پر جاتے تو مخصوص شاہی ٹرین میں۔ شاہی ملازمین کے علاوہ محرمات بھی ساتھ ہوتیں اور اگر ٹرین کو سہ پہر میں روانہ ہونا ہوتا تو محرمات کی ڈھلائی صبح ہی سے شروع ہوجاتی تھی۔ ان کو ریلوے اسٹیشن تک پہنچانے کا کام انہیں بہلیوں سے لیا جاتا تھا۔

خیر بہلیوں کو دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے سمجھا شاید ان میں شاہی محل کی خواتین بیٹھی ہوئی ہیں مگر پھر خیال آیا کہ دن دہاڑے شاہی خواتین کا ہوٹل میں کیا کام۔ بہلیاں آہستہ آہستہ شہ نشین کے پاس آکر رک گئیں۔ ہوٹل کے ملازمین نے پردہ اُٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر سے کیک، پیسٹری اور پھلوں کے خوان نکل رہے ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بھی ٹہلتا ٹہلتا بہلیوں کے پاس جا پہنچا۔ جب بہلیاں سامان اُتار کر چلی گئیں تو میں نے ایک بیرے سے پوچھا کہ یہ کیک پیسٹری کے خوان کہاں سے آئے۔ تب

عقدہ کھلا کہ اعلیٰ حضرت آصف سابع شہریار دکن کا ''خفیہ معاہدہ'' ویکاجی ہوٹل کے مالکان سے ہے۔ اعلیٰ حضرت کو کنگ کوٹھی میں کسی معزز مہمان کی دعوت کرنی ہوتی تو ضیافت کا انتظام خود کرتے تھے البتہ سامان کی فراہمی کا ٹھیکہ ویکاجی ہوٹل کو دیا جاتا تھا۔ نظام حکومت سے پورا بل وصول کرتے تھے لیکن ویکاجی والوں سے ان کا یہ سمجھوتہ تھا کہ جو سامان بچ جائے گا ہوٹل والے اُسے آدھے دام پر خرید لیں گے اور رقم براہ راست نظام کو ادا کر دیں گے۔

نظام محصول اندازی کے جدید فن سے واقف نہ تھے، یوں بھی ان کی رعایا میں مزید محصول ادا کرنے کی سکت باقی نہیں تھی لیکن زر اندوزی کے ہنر انہیں خوب آتے تھے۔ اگر وہ کسی شادی میں شریک ہوتے تھے تو میزبان کے علاوہ پہلی صف کے ممتاز مہمانوں کو بھی فی کس ایک اشرفی اور چار روپیہ نظام کو نذر کرنے پڑتے تھے۔ اس لیے لوگ اعلیٰ حضرت کو مدعو کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ اس کے باوجود نظام کبھی کبھی شادیوں میں بن بلائے شریک ہو جایا کرتے تھے۔

ان کے پاس حیدر آباد کے عمائدین اور روٴسا کی فہرست رہتی تھی اور وہ ان بد نصیبوں کو باری باری ''خاصہ مبارک'' سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ کنگ کوٹھی کی سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے ''خاصہ مبارک'' کا منظر کئی بار دیکھا تھا۔ ایک سِدّی یعنی حبشی سر پر خوان رکھے چلتا تھا۔ خوان پر سُرخ رنگ کا کارچوبی خوان پوش پڑا ہوتا تھا اور آگے آگے ایک باوردی چوبدار ہوتا تھا۔ جب تک اس خاصہ کی زیارت نہیں ہوئی تھی، تصوّر کی آنکھیں ان کو شاہی نعمتوں سے لبریز دیکھتی تھیں۔ ایک روز قاضی صاحب کا نوکر بھاگا ہوا اندر آیا اور گھبرا کر کہنے لگا کہ خاصہ مبارک آیا ہے۔ قاضی صاحب مسکرائے اور آپا سے کہنے لگے: ''بیگم صاحب، موذی نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اب یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا۔ لاؤ ایک اشرفی اور چار روپیہ۔'' آپا نے کہا ''روپے تو ہیں مگر اشرفی میں

کہاں سے لاؤں؟" خیر دوڑ بھاگ کی گئی اور پڑوسیوں سے ایک اشرفی حاصل کی گئی۔ جب خاصہ اندر آیا اور خوان پوش اٹھایا گیا تو اس کے اندر ایک باسی کلچہ اور دو سڑے ہوئے آم رکھے ہوئے تھے۔ یہ خاصہ مبارک تھا جس کی قیمت ایک اشرفی اور چار روپیہ قاضی صاحب کو اُدا کرنی پڑی۔

دولت کی ہوس شاید میر عثمان علی خاں کی گھٹی میں پڑی تھی چنانچہ ان کے بچپن کا ایک قصہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے والد میر محبوب علی خاں اس غضب کے قادر انداز تھے کہ نشانے کی مشق چوَنّی اُچھال کر کرتے تھے اور وہ بھی نشے کے عالم میں مگر کیا مجال جو چونی زمین پر گر جائے۔ باپ کو دیکھ کر بیٹے کو بھی نشانہ بازی کے جوہر دکھانے کا شوق ہوا۔ چوبدار نے چونی ہوا میں اُچھالی، کمسن ولی عہد نے بندوق چلائی مگر نشانہ خطا کر گیا۔ چونی زمین پر گری اور ریت میں غائب ہو گئی۔ میر عثمان علی خاں کو خطائے نظر سے زیادہ چونی کے گم ہونے کا ملال تھا۔ وہ چونی ڈھونڈ رہے تھے کہ میر محبوب علی خاں ادھر سے گزرے۔ پوچھا "کیا ڈھونڈ رہے ہو۔" عرض کی "چوَنّی۔" حاتم صفت فرماں روا کو بیٹے کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی۔ حکم دیا کہ چوَنیوں سے بھری تھیلیاں لے آؤ اور ولی عہد کے حوالے کر دو۔ میر عثمان علی خان نے وہ تھیلیاں لے لیں لیکن گم شدہ چونی کی تلاش جاری رہی۔

مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے والیانِ ریاست کے برعکس وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے والد میر محبوب علی خاں جو شیروانی ایک بار پہن لیتے تھے اُس کو دوبارہ استعمال نہیں کرتے تھے لیکن میر عثمان علی خاں اس قسم کے ٹھاٹھ باٹھ کے شوقین نہ تھے۔ معمولی کپڑے کی شیروانی، دیسی سلیم شاہی جوتے اور ترکی ٹوپی، یہ تھا اُن کا روزمرہ کا لباس۔ وہ شادیوں اور ضیافتوں میں بھی عموماً یہی لباس پہن کر جاتے تھے۔ وہ فضول خرچ بالکل نہ تھے مگر داد و دہش سے گریز بھی نہ کرتے تھے۔

وں نے ادیبوں اور عالموں کو فیض پہنچانے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور
ر دوسری درسگاہوں کو عطیوں سے نوازا اور بہت سے حاجت مندوں کے وظیفے مقرر
۔ اس لحاظ سے اُن کی نام نہاد بخیلی دوسرے والیانِ ریاست کی عیاشیوں سے کہیں زیادہ
قِ ستائش ہے۔

اُردو کانگریس اور ایلورہ

دوسری جنگِ عظیم کا خون آلود آفتاب ڈھل رہا تھا کہ ایک دن قاضی صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ حیدر آباد میں اُردو کانگریس ہونے والی ہے۔ میں بمبئی کے ادیبوں اور صحافیوں کو دعوت نامے بھیج رہا ہوں، تم اُن لوگوں کو کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کرو اور خود بھی ضرور آؤ۔ خط کے ہمراہ کانفرنس کا بہت مرعوب کن پروگرام بھی ملفوف تھا۔ اُردو کانگریس کا ذکر سن کر ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس تنظیم کا نام اس سے پیشتر کسی اخبار میں پڑھا تھا اور نہ اس کی سرگرمیوں کی خبر کہیں نظر سے گزری تھی مگر قاضی صاحب کے حکم کی تعمیل واجب تھی چنانچہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اور میں حیدر آباد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ صفیہ مرحومہ (صفیہ کی موت کو نو سال ہو چکے ہیں لیکن آج بھی انہیں مرحومہ لکھتے وقت قلم کانپتا ہے) اور اُن کا آٹھ نو سال کا لڑکا سمیع بھی ہمارے ساتھ جانے والے تھے۔ قاضی صاحب جب یومِ غالبؔ کی صدارت کرنے بمبئی آئے تھے تو آپا کے ہمراہ صفیہ کے ساتھ ہی ٹھہرے تھے اور دونوں میاں بیوی کو صفیہ اتنی پسند آئی تھی کہ اُنہوں نے صفیہ کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔

حیدر آباد پہنچے تو قاضی صاحب صفیہ اور سمیع کو اپنے گھر لے گئے۔ ہم لوگ البتہ بشیر باغ میں ٹھہرائے گئے جو سرکاری مہمان خانہ بلکہ محل تھا۔ وہاں دیکھا تو دہلی، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، لکھنؤ غرض کہ اُردو کے ہر بڑے مرکز سے مندوب آئے ہوئے ہیں اور مہمانوں کی خوب خوب خاطریں ہو رہی ہیں۔ مخدومؔ سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ اُردو کانگریس دراصل انجمن ترقی اُردو کے مقابلے پر بنائی گئی تھی اور نئے صدرِ اعظم نواب صاحب چھتاری اُس کی پشت پر تھے۔ دراصل وہ رنجش اب رنگ لا رہی تھی جو نہ جانے کس وجہ سے مولوی عبدالحق صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب نے اس کانفرنس میں شرکت کی لیکن بڑے رکھ رکھاؤ سے۔ اُردو کی ایک متوازی انجمن کے قیام سے اُن کو روحانی صدمہ ضرور پہنچا ہوگا لیکن انہوں نے کانگریس کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ کسی تجویز کی مخالفت کی، البتہ عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم جو مولوی صاحب کے دستِ راست بلکہ ترجمان تھے، اپنی تقریروں میں اُردو کانگریس پر جی بھر کر برسے اور قاضی صاحب سے اُن کے خوب خوب معرکے ہوئے۔

اس کانفرنس کے اجلاس باغِ عام کے بڑے ہال میں منعقد ہوئے تھے۔ وہاں بہت سی تجویزیں منظور کی گئیں اور بہت سی کمیٹیاں بنائی گئیں لیکن اُن کا حاصل نشستند و گفتند و برخاستند سے زیادہ نہ نکلا۔ اجلاس کے بعد اُردو کانگریس کا نام پھر کبھی سننے میں نہ آیا البتہ انجمن ترقی اُردو کو حیدر آباد سے جو مالی امداد ملتی تھی وہ بند ہو گئی۔ شاید اُردو کانگریس کے منتظمین کا اصل مدّعا بھی اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

اُردو کانگریس کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ نے بھی اپنی ایک چھوٹی سی کانفرنس کر ڈالی۔ اس کانفرنس کی صدارت کس نے کی، مقالے کن لوگوں نے پڑھے، جلسہ کہاں ہوا، کچھ یاد نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ چار پانچ بچوں نے اس جلسے میں اقبال کی نظم از خوابِ گراں خیز دلکش دُھن میں سنائی تھی اور سماں باندھ

دیا تھا۔ ہم لوگوں کو ان بچوں کی معصوم انقلابیت پر بہت پیار آیا تھا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ حیدر آباد وہ پرانا حیدر آباد نہیں رہا بلکہ اب وہاں چنگیزیٔ افرنگ کی مذمت اعلانیہ کی جا سکتی تھی، نہ جانے وہ بچے اب کہاں اور کس حال میں ہیں۔

اُردو کانگریس میں سکندر علی وجد بھی شریک تھے۔ وہ جب کبھی کسی سرکاری کام سے بمبئی آتے تو ہم لوگوں سے ضرور ملتے۔ حیدر آباد کے دوستوں کا حال بیان کرتے، اپنی نظمیں سُناتے، تھوڑی دیر ہنستے بولتے اور چلے جاتے۔ اُردو کانگریس میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے تم لوگ اورنگ آباد ہوتے ہوئے بمبئی کیوں نہیں جاتے۔ مفت میں دولت آباد اور ایلورہ کی سیر ہو جائے گی اور وقت بھی زیادہ نہیں لگے گا۔ اورنگ آباد میں ہمارے قیام کی اور ایلورہ جانے کے انتظام کی ذمہ داری بھی اُنہوں نے لے لی کیونکہ مہمان نوازی ہر حیدر آبادی کا پیدائشی حق ہے۔

اورنگ آباد جانے والی گاڑی کاچی گوڑہ ریلوے اسٹیشن سے بہت سویرے چھوٹتی تھی اور ہم لوگوں کو ظفر نے رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا لہٰذا طے پایا کہ کھانے کے بعد وہیں سو جائیں تاکہ گاڑی پکڑنے میں آسانی رہے۔ یوں بھی ہم لوگ بشیر باغ کے پُر تکلف ماحول سے تنگ آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ دوستوں میں بیٹھ کر شور وغُل مچائیں۔ لیکن ظفر کے گھر پہنچے تو یوں محسوس ہوا کہ کسی بارات میں آئے ہیں یا ظفر صاحب نے اپنے ولیمہ کی رسم دہرائی ہے (ظفر کی شادی اسی سال ہوئی تھی) ظفر کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ خیال تھا مہمان کھانے کے بعد چلے جائیں گے تب اپنی محفل جمے گی لیکن کھانے کے بعد رؤف کا گانا شروع ہو گیا۔ اتنے میں مخدوم نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اُٹھ کر مخدوم کے پاس گیا تو مخدوم نے کہا، گانے والے کو گولی مارو، چلو باتیں کریں گے چنانچہ ہم دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک گئے اور ظفر کے سونے کے کمرے میں گھس کر مسہری پر دراز ہو گئے، لحاف اوڑھ لیا۔ لحاف کے اندر سوکھے میوے کی پلیٹیں رکھ لیں اور میوہ کھاتے

اور باتیں کرتے رہے۔ چائے کے وقت جب سوکھے میووں کی تلاش ہوئی اور ہم دونوں کو ڈھونڈا گیا تو پتہ چلا کہ چوری کا مال ہضم ہو چکا ہے اور چور خواب گاہ میں محوِ خواب ہیں۔

ہماری دوسری رات اورنگ آباد میں سکندر علی وجدؔ کے کسی عزیز کے گھر گزری۔ صبح تڑکے ہم لوگ ایلورہ اس وقت پہنچے جب سورج کی پہلی کرنیں مہاتما بدھ کے قدم چوم رہی تھیں۔ جنوبی ہند کے پہاڑ شمالی ہند کے پہاڑوں سے لاکھوں برس پُرانے ہیں۔ ان کی چٹانیں ہمالیہ کی چٹانوں سے زیادہ دیرپا، زیادہ ٹھوس، سخت اور چکنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سنگ تراشی کے بہترین نمونے وندھیاچل کے جنوب ہی میں ملتے ہیں۔ بادامی، اندھیری، ایلورہ، اجنتا، مہابلی ورم، کانچی ورم، ملاپورم سب دکن ہی میں واقع ہیں۔

ایلورہ کے غار اورنگ آباد سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں جب اس علاقے میں طوائف الملوکی پھیلی تو نہ پروہت اور پجاری رہ گئے نہ بھکشو اور سنت۔ غاروں کے دھانے رفتہ رفتہ ملبوں اور جنگلی درختوں سے پٹ گئے اور آنے والی نسلیں ان غاروں کے نام و نشان سے بھی بے خبر ہو گئیں۔ انیسویں صدی میں اتفاقاً ایک انگریز شکاری کا اُدھر سے گزر ہوا تو اُسے ایک غار کا دہانہ دکھائی دیا۔ شکاری اُسے جنگلی جانور کی ماند سمجھا مگر دھانے کو صاف کروایا تو غار کے اندر انسانی تہذیب کے بیش بہا خزانے نظر آئے۔

ایلورا کے غار نیم دائرے کی شکل میں میل سوا میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ غاروں کا رُخ پورب کی طرف ہے۔ اس کی وجہ سے اُن کے اندرونی حصوں میں دن بھر روشنی رہتی ہے۔ ان غاروں میں ہندو، بودھ اور جین تینوں مذہبوں کے فن کاروں نے اپنی عقیدت کا اظہار حسن و جمال کے شاہکاروں کی صورت میں کیا ہے۔ یہ غار تعداد میں ۳۴ ہیں اور برابر برابر بنے ہوئے۔ پہلے پندرہ غار بدھوں کے ہیں جو چوتھی اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیان تراشے گئے تھے۔ درمیان کے چودہ غار ہندوؤں کے مندر ہیں جو ساتویں

صدی اور بارھویں صدی کے درمیان تعمیر ہوئے۔ آخری پانچ غار جینیوں کے ہیں۔

یہ غار پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے فرش اور چھتیں، ستون اور دیواریں، مجسّمے اور مورتیاں، گائے، بیل، ہاتھی، گھوڑے، شیر، ناگ، درخت، بیلیں اور پھول، دریا اور پہاڑ سب ایک ہی پتھر سے تراشے گئے ہیں۔ اُن میں جوڑ اور پیوند نام کو بھی نہیں ہے۔

بدھوں کے وہار (جو خانقاہیں ہیں) سب سے پرانے ہیں۔ اُن میں بعض غار تو دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں ہیں۔ عمارتیں کیا، کئی کئی سو فٹ لمبے چوڑے ہال ہیں جن کی چھتوں کو ستونوں کا سہارا دیا گیا ہے حالانکہ چھت اور ستون ایک ہی پتھر سے تراشے گئے ہیں، وہیں ہال میں جابجا گوتم بدھ کے مجسّمے بنے ہیں جن میں گوتم بدھ کو کنول کے پھول پر کھڑا اور بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بودھ مالا کی پوری پوری کہانیاں ستونوں میں اُبھار دی گئی ہیں۔

لیکن پروازِ تخیل اور جرأتِ تخلیق کے اعتبار سے ایلورہ کے ہندو عہد کی سنگتراشی کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یہ عہد راشٹر کوٹ خاندان کے بانی مہاراجہ دانتی دُرگا نے بادامی (بیجاپور) کے چالوکیہ خاندان کو ۷۵۳ء میں شکست دی اور دکن، مالوہ، گجرات، چتوڑ، قنوج اور کالنجر وغیرہ کو اپنے راج میں شامل کر لیا اور ایلورہ کو جس کا قدیم نام ایلاپورم تھا اپنی راجدھانی بنایا۔ یہ جگہ چونکہ پہلے ہی سے بدھوں اور جینیوں کی مقدس تیرتھ گاہ تھی اس لیے راجہ دُرگا دانتی نے بدھوں کے وہار تین تال سے ملا ہوا "درسِ اوتار" نام کا ایک مندر غار کے اندر ترشوایا۔ راشٹر کوٹ خاندان شیوجی کا پُجاری تھا چنانچہ اس مندر میں انہیں کے قصے دیواروں اور ستونوں پر ابھارے گئے ہیں۔ مندر کے عقبی حصے میں لنگ رکھا ہوا ہے اور وسط میں بہت بڑا یجن شالہ یعنی قربانی کا ہال ہے۔

ہندو دیومالا میں شیوجی رقّاصِ فلک (نٹ راج) ہیں۔ اُن کا رقص ابدیت ہے۔

تخلیق کائنات ہے، حیات ہے، حرکت ہے اور موت ہے۔ ایلورا کے مندروں میں شیو جی کے رقص کے مختلف پہلوؤں کو بڑی چابک دستی سے اسیر سنگ کیا گیا ہے۔ ان ناچوں میں شیو جی کہیں تنہا ہیں اور کہیں اپنی محبوبہ اپنی پاروتی جی کے ہمراہ ہیں۔ ان مجسموں کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ غالبؔ کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

دیدہ وراں کہ تانہد دِل بہ شُمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقص بُتانِ آذری

رقص بتانِ آذری کے جو نمونے آذر کے شہر اُر (جنوبی عراق) سے برآمد ہوئے ہیں وہ بھی ایلورا کے رقص کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

دس اوتار مندر کے دو مناظر ایسے ہیں جو مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔ پہلا منظر تو غار کے دہانے کے پاس ہی ہے۔ اُس میں مہادیو (شیو جی) بڑا بھیانک روپ دھارے ہوئے ہیں۔ اُن کی کمر سے کھوپڑیوں کی مالا لٹک رہی ہے۔ جسم پر ناگ لپٹا ہوا ہے۔ ناگ کا منھ کھلا ہوا ہے اور اُس کے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اُن کا ترسول ایک راکشش کے بدن میں پیوست ہے اور راکشش زخم کی تکلیف سے بے تاب ہو کر آنکھوں کی زبان سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ مہادیو جی پاؤں سے ایک اور راکشش کو کچل رہے ہیں اور فتح کی خوشی میں ڈمرو بجا رہے ہیں۔ اُن کے چلّو میں خون بھرا ہوا ہے اور کالی ماتا منھ کھولے، بال بکھرائے خون پینے کی منتظر ہے۔ کالی کی آنکھیں اندر گھُسی ہوئی ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھُرا اور دوسرے میں پیالہ ہے۔ راکشش کا گرم خون شاید وہ اسی پیالے میں لینا چاہتی ہے۔ اُس کی پُشت پر ایک اُلّو بیٹھا خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ دائیں جانب پاروتی جی نیم برہنہ کھڑی ہیں۔ راکشش کے پاؤں کے پاس ایک آدمی بڑی بھیانک ہنسی ہنس رہا ہے۔ اُس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔

دوسرا منظر نرسنگھ دیوتا کا ہے جو ایک ناپاک اور بدکردار بھوتنی "ہریاں کسیپو" کو

ہلاک کر رہا ہے۔ اس میں پہلے منظر کا سا بھیانک پن تو نہیں ہے مگر ڈرامائی قوت اور آہنگ ترتیب کے لحاظ سے یہ منظر پہلے سے کم اثر انگیز نہیں ہے لیکن ایلورا کی معراجِ کمال کیلاش کا مندر ہے۔ کیلاش مندر کی تاریخ کافی طویل ہے۔ اس کی ابتدا مہاراجہ دانتی دُرگا کے عہد میں ہوئی اور تکمیل دو سو برس بعد مہاراجہ کرشن سوئم (۹۳۹ء۔۹۶۸ء) کے زمانے میں لیکن مندر کا زیادہ حصہ مہاراجہ کرشن راج (۷۵۷ء۔۷۷۲ء) نے بنوایا تھا۔ اس کے تمام اجزا بھی ایک ہی بڑی چٹان سے تراشے گئے ہیں۔

کیلاش مندر ۱۶۴ فٹ لمبا اور ۱۰۹ فٹ چوڑا ہے۔ مندر کا صحن ۲۷۶ فٹ لمبا اور ۱۵۴ فٹ چوڑا ہے اور اس کی کرسی ۲۵ فٹ اُونچی ہے۔ کرسی کی دیواروں پر ہاتھی اور شیر تراشے گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ پورے مندر کا بوجھ انہیں جانوروں پر ہے۔ مندر میں داخل ہونے کے لیے ایک سنگی سائبان میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مندر اور سائبان کے بیچ میں شیوجی کے مشہور بیل نندی کا بہت بڑا مجسمہ ہے۔ مندر کے اندر ستون بنے ہیں اور بیچ میں لنگ رکھا ہے۔ بیرونی دیواروں پر دیومالا کی کہانیاں تراشی گئی ہیں۔ کہیں راون کو کیلاش ناتھ کے مندر کو ہلاتے دکھایا گیا ہے، کہیں جمنا دیوی (دریائے جمنا) کی منظر کشی کی گئی ہے اور کہیں شیوجی تانڈو ناچ ناچ رہے ہیں۔

اس مندر کا طرزِ تعمیر بالکل نرالا ہے۔ اس کا مقابلہ تو مصر کے اہرام بھی نہیں کرسکتے۔ اہرام بنانے والوں نے پہلے اہرام کا نقشہ تیار کیا، پھر اس نقشے کے مطابق زمین میں نیو کھودی اور ترشے ہوئے پتھروں کے بڑے بڑے بلاک زینہ دار رکھتے ہوئے چوٹی تک چلے گئے لیکن کیلاش کے مندر میں نیو کھودنے کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ اسے تو چٹان میں سے کاٹنا تھا لہٰذا یہاں اہرام کے برعکس تعمیر کا عمل چوٹی سے نیچے کی طرف تھا۔ سنگ تراشوں نے سب سے پہلے ایک ایسی چٹان کو چُنا جو پورب کی جانب کھلی ہوئی تھی۔ اُسے تین طرف سے خوب گہرا کاٹا، یہاں تک کہ وہ بقیہ پہاڑ سے بالکل الگ ہوگئی۔ اس محنت

طلب کام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہاڑ اور مندر کے درمیان ایک سو فٹ چوڑی خندق ہے۔ جب یہ چٹان جو دو سو فٹ لمبی سو فٹ چوڑی اور سو فٹ اُونچی ہے اصل پہاڑ سے الگ ہو گئی تو اُس کو تراش تراش کر مندر کی شکل دی گئی۔ پھر اس کو اندر سے کھوکھلا کر کے اس میں ستون، کنگیاں طاق، طاقچے، دیواروں میں دھنسے ہوئے ستون، غلام گردش اور ہال کے کمرے نکالے گئے۔ اس جان لیوا کھدائی میں ہزاروں مزدوروں اور کاریگروں کا خون پسینہ بن کر بہا ہو گا۔ لاکھوں روپے اور کروڑوں گھنٹے صرف ہوئے ہوں گے اور خندق کاٹنے اور مندر کو اندر سے کھوکھلا کرنے میں نہ جانے کے لاکھ ٹن پتّھر کے ٹکڑوں کو کھود کر باہر پھینکا گیا ہو گا تب کہیں یہ مندر بنا ہو گا۔ اِس جسمانی محنت کے علاوہ معماروں اور کاریگروں کو مندر کا نقشہ تیار کرنے میں کتنی مشکلیں پیش آئی ہوں گی۔ ایک ایک ستون، ایک ایک محراب، طاق، سائبان، مورتی، جانور اور دوسری چیزوں کا مقام، اُن کا حجم اور اُن کی تمام تفصیلات کو ذہن میں ترتیب دینا پڑا ہو گا اور پھر ان چیزوں کو نہایت احتیاط اور کامل اعتماد سے تراشا گیا ہو گا۔ بھُول چوک اور غلطی کی وہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ دوسری عمارتوں کا تو یہ ہے کہ معمار کو اگر کوئی محراب یا نقش پسند نہیں آیا تو اُس نے عمارت کے اس حصے کو ڈھا دیا، کسی پتھر کی تراش خراش ٹھیک نہیں ہوئی تو اُسے بدل کر دوسرا پتھر لگا دیا، کوئی مورتی کوئی مجسمہ اچھا نہیں لگا تو اس کی جگہ دُوسری مورتی بنوالی، دوسرا مجسمہ نصب کر دیا مگر کیلاش کے مندر میں سنگ تراش کو اس کا موقع نہیں تھا، وہ بے چارہ تو پتھر کے ایک ٹکڑے کو بھی بدل نہ سکتا تھا کیونکہ ٹکڑا پوری چٹان کا جز تھا۔ اِس سنگ تراش کی دشواری اُس افسانہ نویس سے بھی زیادہ تھی جس کو افسانے کا پلاٹ بتا دیا جائے اور کاغذ قلم دے کر کہا جائے کہ افسانہ لکھو مگر پہلے حرف سے آخری حرف تک تم کسی لفظ کو کاٹ سکتے ہو نہ اپنی عبارت میں کوئی تبدیلی کر سکتے ہو۔ کتنا مشکل تھا یہ کام! اور ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک سنگ تراش کا نہ تھا بلکہ سینکڑوں سنگ تراشوں نے مل کر اسے پورا کیا ہو گا

کیونکہ کیلاش کے مندر میں ایک دو نہیں بلکہ درجنوں داستانیں اور سینکڑوں مورتیاں پتھروں پر اُبھاری گئیں ہیں۔ ان میں ہر ایک ایسی ہے جس کو تراشنے میں کئی برس صرف ہوئے ہوں گے۔

ہم لوگ دوپہر تک ان غاروں میں گھومتے رہے اور جب پیروں نے چلنے سے جواب دے دیا اور بھوک ستانے لگی تو باہر نکلے کہ تازہ دم ہو کر دوبارہ غاروں میں گھسیں گے۔ معلوم نہیں ان عجائباتِ عالم کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ غاروں سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ذرا نشیب میں ایلورا کی پرانی بستی ہے۔ ہم نے روٹی کی تلاش میں اُدھر کا رُخ کیا۔ ہم لوگ کھیتوں کی منڈیر پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک میری نظر ایک پتھر پر پڑی۔ قریب جا کر دیکھا تو کسی بُت کا ہاتھ تھا جو نہ جانے کب سے وہاں ٹوٹا پڑا تھا۔ اُس کی انگلیاں، کلائی، کہنی سب سلامت تھے۔ میں نے خوش ہو کر اُسے اٹھا لیا اور کندھے پر لے کر چلنے لگا مگر یہ ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ تھوڑی دور چلنے کے بعد میری طاقت جواب دینے لگی۔ میں نے سردار جعفری سے بہت کہا کہ یار تھوڑی مدد کر دو مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ آثارِ قدیمہ کا ایسا ہی شوق ہے تو اپنی صلیب خود اٹھاؤ، میں تمہاری حماقتوں میں شریک نہیں ہوں گا۔ میں نے بہت خوشامد کی، بہت گالیاں دیں مگر وہ بالکل نہ پسیجا۔ آخر میں نے ہمّت ہار دی اور اس نایاب ہاتھ کو وہیں کھیت میں پھینک دیا۔ البتہ موڈ اتنا خراب ہوا کہ میں نے شام تک کسی سے بات نہ کی۔ اُس ہاتھ کو کھو دینے کا قلق مجھے آج بھی ہے۔

گاؤں کے قریب ہم نے ایک آدمی سے پوچھا کہ بھائی اس بستی میں کوئی ہوٹل یا نان بائی کی دکان بھی ہے جہاں کچھ کھانے کو مل جائے (یہ واقعہ اب سے چالیس سال پہلے کا ہے) اُس نے جواب دیا کہ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے لیکن آپ لوگ اگر میرے گھر چلیں تو میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر دوں گا۔ ہم لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔ دریافت

کرنے پر پتہ چلا کہ وہ غاروں کی چوکیداری کرتا ہے اور وقتِ ضرورت سیاحوں کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اُس نے ہم لوگوں کے لیے باہر درخت کے نیچے ایک چارپائی بچھادی۔ صفیہ کو اپنی بیوی سے ملانے جھونپڑی کے اندر لے گیا اور تھوڑی دیر میں پانی کا گھڑا اور المونیم کے دو گلاس لے آیا۔ ہم لوگوں نے پانی پیا، منھ ہاتھ دھویا۔ اتنے میں وہ ایک پیالے میں دال، تھوڑا سا اچار اور چار پانچ انڈوں کا خاگینہ اور گرم گرم روٹیاں لے آیا۔ بھوک اور تھکن میں چوکیدار کے گھر کی یہ روٹیاں بشیر باغ کی بریانی اور مرغِ مُسلّم سے زیادہ لذیذ معلوم ہوئیں۔

چلتے وقت جب ہم لوگ اُسے کھانے کے دام دینے لگے تو اُس نے انکار کردیا۔ بہت اصرار کیا تو کہنے لگا اچھا دے دیجیے مگر بی جی کے کھانے کے پیسے میں نہیں لوں گا، وہ تو گھروالی کی مہمان تھیں۔

ہمیں پانچ بجے اورنگ آباد کے ادیبوں کے عصرانے میں شریک ہونا تھا اور نو بجے ہمارا پروگرام ریڈیو اسٹیشن پر تھا۔ یہ پروگرام ظفرؔ اور سکندر علی وجدؔ کی کوششوں کا نتیجہ تھا تاکہ ہمارا سفر خرچ پورا ہو جائے۔ سردار اور کیفی کو تو فکر نہ تھی کیونکہ انہیں نظمیں پڑھنی تھیں۔ البتہ مجھے اُردو کے "نئے ادب" پر مضمون پڑھنا تھا اور میں نے یہ مضمون اُس وقت تک نہ لکھا۔

ہم لوگ راستے میں اورنگ زیب کی قبر پر رُکے اور قلعۂ دولت آباد کی سیر کرنے کے بعد شام ہوتے ہوتے اورنگ آباد واپس پہنچے۔ ادیب بیچارے ہمارے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد میں تو معذرت کر کے کھسک لیا، البتہ سردار جعفری، کیفی اور صفیہ رات گئے تک ادیبوں سے باتیں کرتے رہے۔ یوں بھی سردار جعفری کو "حاضرین" مل جائیں تو لیکچر دیے بغیر اُس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

قیام گاہ پر پہنچ کر میں نے جوں توں دو چار صفحے مضمون کے گھسیٹے اور وقتِ مقررہ پر

ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ مضمون پڑھ کر وقت کا حساب لگا سکتا۔ خیر کیفی اور جعفری کی نظموں کے بعد میری باری آئی تو میں نے جان بوجھ کر پڑھنے کی رفتار گھٹا دی تاکہ مضمون کم نہ پڑ جائے مگر وہی ہوا۔ میں آخری صفحہ پڑھ رہا تھا کہ گھڑی پر نگاہ پڑی۔ ابھی پورے چھ منٹ باقی تھے۔ میں نے رفتار اور کم کر دی پھر بھی بات نہ بنی۔ تین منٹ اب بھی باقی تھے اور مضمون ختم ہو چکا تھا۔ میں بدستور کبھی گھڑی کی جانب دیکھتا اور کبھی سامنے رکھے ہوئے کاغذ کی جانب۔ جب وقت ختم ہوا تو میں نے بھی اپنا آخری فقرہ ختم کر دیا۔

آخری سلام

دوسری جنگِ عظیم میں سویت یونین کی فتح یابیوں کے باعث اشتراکی خیالات ملک میں بہت مقبول ہو رہے تھے۔ ہر شخص سُرخ فوج کی جانبازی، سرفروشی اور شجاعت کا معترف تھا۔ لوگ اشتراکی لٹریچر بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ اشتراکیت میں اُن کے مسائل کا کوئی حل ہے کہ نہیں۔ اشتراکیوں پر سے پابندیاں اٹھالی گئی تھیں حتیٰ کہ حیدر آباد میں بھی اُن کی باقاعدہ تنظیم قائم ہو گئی تھی۔

مخدوم نے جو سٹی کالج میں اُردو کے لیکچرار تھے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور نظام اسٹیٹ ریلوے کے مزدوروں کی خدمت میں مصروف ہوگئے تھے۔ اس کی وجہ سے اُنہیں شعر کہنے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا لیکن وہ ترقی پسند ادیبوں کے بدستور رہبر و رہنما تھے بلکہ شہر میں اب اُن کی حیثیت نوجوانوں کے روحانی پیشوا یا گرو کی ہو گئی تھی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں حیدر آباد کی انجمن ترقی پسند مصنّفین نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک کُل ہند کانفرنس حیدر آباد میں منعقد کی۔ اس کانفرنس میں لاہور، لکھنؤ، الٰہ آباد، پٹنہ، بمبئی اور دوسرے مقامات کے ادیبوں نے

شرکت کی۔ منتظمین میں ابراہیم جلیس، نظر حیدر آبادی مرحوم، سلیمان اریب، عابد علی خاں جیسے ادیب پیش پیش تھے۔ کانفرنس کے اجلاس تین چار روز تک ہوتے رہے۔ اُس کی رُوداد کرشن چندر نے "پودے" میں اور سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا جو پودا مسز سروجنی نائیڈو کے گھر میں لگایا گیا تھا وہ چند برسوں میں تناور درخت بن گیا ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار مرحوم، مولانا حسرت موہانی مرحوم، نیاز حیدر ناکام اور ڈاکٹر تاراچند سے آخری بار اسی کانفرنس میں ملاقات ہوئی مجھے کیا معلوم تھا کہ سرزمین دکن کو یہ میرا آخری سلام ہوگا۔

تین سال بعد مخدوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی لیکن حالات بہت بدلے ہوئے تھے۔ ریاست حیدر آباد کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ معاشرہ اور تہذیبی اقدار جن پر دکن کو ناز تھا طوفان کی زد میں تھے۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بازار گرم تھا۔ لوگ جذبات کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا، عقل کی باتوں پر کفر کے فتوے لگ رہے تھے اور جُھوٹے خداؤں کی پوجا کی جاتی تھی۔

ہم اور مخدوم گھنٹوں حیدر آباد کی باتیں کرتے رہتے تھے، بیتے دنوں کی باتیں دوستوں کی باتیں، اُن کی نئی اور پرانی وفاداریوں کی باتیں۔ مخدوم بہت دُکھی تھا۔ اُس کی آرزوؤں کا رنگ محل آگ میں جل رہا تھا اور وہ کچھ نہ کر سکتا تھا، انسانی اُلفت کے جن پودوں کو اس نے اپنے خونِ دل سے سینچا تھا، نفرت کی آندھی اُنہیں جڑ سے اکھاڑ رہی تھی اور وہ بے بس تھا۔ میں مخدوم سے پوچھتا حیدر آباد کا حشر کیا ہوگا۔ وہ جواب میں ایک ٹھنڈی سانس کھینچتا اور اپنے خیالوں میں گم ہو جاتا۔

تھوڑی دیر یہی کیفیت رہتی پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرانے

لگتا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا "دوست اُداس مت ہو، انسان پر بھروسہ کرو وہ بہت عظیم ہے، تاریخ پر بھروسہ کرو، اُس کے قانون اٹل ہیں، زندگی پر بھروسہ کرو، وہ اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے، محبت پر بھروسہ کرو، محبت عصائے موسیٰ ہے، محبت لحنِ داؤد ہے، محبت صبر ایوب ہے، محبت پیرہن یوسف ہے، محبت گلزارِ خلیل ہے، محبت قم باذن اللہ ہے۔ گھبراؤ نہیں دوست محبت نفرت پر غالب آئے گی۔" اور پھر مخدوم حیدر آباد واپس چلا گیا۔ ہم لوگوں نے بہت سمجھایا کہ آگ میں مت کودو مگر وہ نہ مانا۔ اُس نے کہا مجھے مت روکو۔ میں اپنے غزالوں کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بھٹک گئے تو میں جی نہ سکوں گا۔ دکن کے غزال سدا اسلامت رہیں۔

میکدے والو اِدھر بھی نگہِ لُطف رہے
دُور سے کعبہ نشیں تم کو دُعا دیتے ہیں

تحصیلِ ذات کا سفر

(یہ مقالہ ۲۵؍اگست ۱۹۷۳ء کو اُردو کے شعلہ نوا شاعر مخدومؔ محی الدین کی چوتھی برسی پر غالب لائبریری کراچی میں پڑھا گیا تھا)

مخدومؔ محی الدین نے اپنے مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کو "محنت اور محبت" کے نام معنون کیا تھا۔ یہ انتساب ایک بلیغ اشارہ تھا ان دو عظیم تخلیقی قوتوں کی طرف جن سے بقائے حیات کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور تخلیقِ حیات کی اُمنگیں حسن و جمال سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مخدومؔ کے کلام کا اس سے موزوں انتساب ممکن ہی نہ تھا کیونکہ چشمۂ حیات کے یہی دو سوتے ہیں جن سے ان کے فکر و فن کی نمو ہوئی ہے چنانچہ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں کہیں تیشۂ فرہاد کی جھنکار ہے اور کہیں شیریں دہنانِ دکن کے نطق و لب کی نغمگی۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی تمام ذہنی اور مادّی تخلیقات محنت اور محبت ہی کا کرشمہ ہیں۔ زبان، ادب، رقص و موسیقی کے تمام فن پارے، مصوری اور سنگتراشی کے تمام

شاہکار، شعر، ناول، افسانے، فلم، یہ لہلہاتے کھیت، یہ دولت اُگلتے کارخانے، یہ سربفلک عمارتیں، یہ رات کو دن کی طرح منوّر کرنے والی روشنیاں، یہ خلائی پروازیں اور ماہ و مریخ کی سیریں، یہ موت کو زندگی اور زندگی کو موت میں تبدیل کرنے والے آلات واوزار، یہ موجوداتِ عالم کی ہیئت اور ماہیت میں انقلاب برپا کرنے والے سائنسی تجربے اور انسان کے شعور و آگہی کو اجالنے والے یہ علوم و فنون سب کے سب محنت اور محبت ہی کا توفیض ہیں۔

مخدومؔ اُس محنت اور محبت کا شیدائی ہے جس سے زندگی میں حسن اور معنی پیدا ہوں، جس سے تخلیقاتِ انسانی کی افادیت اور قدر بڑھے، جس سے انسان کی مسرتوں میں اضافہ اور کلفتوں میں کمی ہو، جس سے انسان کے فکر و احساس کی سطح اونچی ہو۔ وہ اپنی داخلی صلاحیتوں کو پہچانے اور تحصیلِ ذات کی جدوجہد تیز کرسکے۔

تحصیلِ ذات ایک تخلیقی عمل ہے۔ انسان اس عمل کا اظہار کبھی جسمانی قوت کے ذریعہ کرتا ہے اور کبھی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر۔ بہر حال تحصیل ذات کا اظہار خواہ جسمانی ہو یا ذہنی، دونوں میں قدرِ مشترک انسان ی محنت ہی ہوتی ہے۔ اس محنت ہی سے تخلیق کی قدریں متعین ہوتی ہیں خواہ وہ محنت کسی مزدور کی ہو یا کسی فنکار کی۔

موجودہ سماجی نظام کی بنیادی خرابی ہی یہ ہے کہ اس میں انسان کی محنت جو تحصیلِ ذات کا واحد ذریعہ ہے، اب اُس کی اپنی ملکیت نہیں رہی ہے۔ اُسے اب نہ اپنی محنت پر کوئی اختیار ہے نہ محنت کی تخلیق پر، دونوں کسی اور کی ملکیت بن گئی ہیں، دونوں کسی اور کی مرضی اور منشا کی پابند ہوگئی ہیں چنانچہ موجودہ نظام نے دنیا کو ایک عالمگیر بازار میں تبدیل کردیا ہے۔ ایسا بازار جس میں محنت اور محبت دونوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی محنت کو دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کرلیتا اس وقت تک اس کی محنت ایک مردہ حقیقت رہتی ہے۔ اس محنت میں قدر اور اضافیت اسی

وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرکت میں آئے اور وہ حرکت میں اسی وقت آتی ہے جب کوئی دوسرا خرید کر اسے کام پر لگائے۔ مزدوروں اور کسانوں سے تو یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ ان کا روزمرہ کا تجربہ یہی ہے۔ اُن کی محنت جتنی دیر کسی اور کی ملکیت رہتی ہے تخلیقی ہوتی ہے اور جتنی دیر ان کی اپنی ملکیت ہوتی ہے غیر تخلیقی ہوتی ہے۔ اس تضاد کے سبب سے محنت کرنے والے انسان کو نہ تو اپنی محنت سے کوئی دلچسپی باقی رہ جاتی ہے اور نہ اپنی محنت کی پیداوار سے بلکہ وہ اپنی محنت اور محنت کی تخلیقات دونوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ ذات کی یہ بیگانگی ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ہمیں اس بیگانگیِ ذات کو شعورِ ذات اور تحصیلِ ذات کے ذریعہ بدلنا ہوگا۔ شعورِ ذات سے مراد اپنی داخلی صلاحیتوں کو پہچاننا اور پرکھنا ہے اور تحصیلِ ذات سے مراد ان داخلی صلاحیتوں کو بروئےکار لانے میں جو رُکاوٹیں اور پابندیاں ہیں ان کو دور کرنا ہے۔

بیگانگی ذات کا باعث وہ تضاد ہے جو انسان کی ذات، اس کی محنت اور محنت کی پیداوار کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تضاد محنت کرنے والے ہی دور کر سکتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب محنت کرنے والوں کو خواہ وہ ذہنی محنت کرنے والے ہوں یا جسمانی، اس تضاد کا واضح شعور ہو جائے، وہ مویشی بن کر جینے سے انکار کر دیں، اطاعت اور بندگی کا جوا اُتار پھینکیں، اپنے تاریخی منصب کو پہچانیں اور اپنی انسانیت کو منوانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اقبالؔ کا فلسفہ خودی اِسی شعورِ ذات اور تحصیلِ ذات کی ایک تفسیر ہے۔

مخدومؔ محی الدین بیگانگی ذات اور تحصیلِ ذات کے تضاد سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی فکری اور فنی صلاحیتوں کو دوسروں کے ہاتھ بیچنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ محنت کشوں کی جدوجہد میں شریک ہوگئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ معاشرے کے بنیادی تضاد کو حل کرنا محنت کش طبقہ ہی کا تاریخی فریضہ ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے

کہ تحصیلِ ذات کا یہ کٹھن سفر فرداً فرداً طے نہیں کیا جاسکتا بلکہ محنت کشوں کے کاروان حیات میں شامل ہو کر ہی تحصیلِ ذات کی تکمیل ممکن ہے۔ اُن کی فنی صلاحیتیں بھی اسی جدوجہد کے دوران میں نکھریں اور اس جدوجہد کا ایک جز بن گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے فلسفہ حیات سے ہم آہنگ کرلیا۔

فن شعورِ ذات اور تحصیلِ ذات کا جمالیاتی اظہار ہے۔ فن کار کا شعور اگر بیدار ہے تو وہ اُس تضاد سے آنکھیں نہیں چُرا سکتا جو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ دراصل اس تضاد کا احساس ہی اس کے فن کا اصولِ توانائی بن جائے گا۔ چنانچہ مخدومؔ "گُلِ تر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ: "شاعر اپنے گردوپیش کے خارجی عالیم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کش مکش اور تضاد پاتا ہے۔ یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے"۔ شاعر آزادی اور مساوات کا آرزومند ہے مگر اسے اپنے چاروں طرف محکومی اور نابرابری نظر آتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ "شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار" مگر اُسے "ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دُھواں" اُٹھتا نظر آتا ہے۔

نہ تابناکیِ رُخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں، کلی کلی مغموم
ہے گُل جہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم
حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
ابھی دماغ پہ قبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رُکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار

گردوپیش کی دنیا اور ان کے دل کی دنیا کے درمیان جو تضاد تھا مخدومؔ نے اسے

طالبِ علمی کے زمانے میں ہی محسوس کرلیا تھا۔ وقت کے ساتھ یہ احساس ان کا ایمان و یقین بن گیا اور انہوں نے اپنی ساری زندگی اس تضاد کو حل کرنے اور گرد و پیش کی دنیا کو اپنے دِل کی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد کے نذر کردی۔ تحصیلِ ذات کا یہ سفرِ دِل کے جان لیوا دورے کے ساتھ ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو دہلی میں تمام ہوا۔

مخدومؔ کی ذہنی تربیت اس زمانے میں ہوئی جب کہ برِ صغیر پاک و ہند میں روحِ انسانی ایک تومند احساسِ زیست کے ساتھ بیدار ہو رہی تھی۔ یہ بیداری ایک سوال تھی، اپنے آپ کو نئے سرے سے دریافت کرنے اور پہچاننے کی ایک طلب تھی۔ اُس وقت ہمارا معاشرہ ارتقاء کی اس منزل میں تھا جہاں پہنچ کر سماج کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں کی تشفی آزادی کے منفی نعروں سے نہیں ہوتی بلکہ معاشرہ اپنے وجود کے لیے مثبت بعد اور نئی وسعتوں کا متلاشی ہوتا ہے۔ ان وسعتوں کو ستم گزیدہ انسانیت کی آرزوؤں اور اُمنگوں نے معنی عطا کیے۔ یہ وہ انسانیت تھی جو صدیوں سے ایک فرسودہ اور زوال آمادہ سماجی نظام کی چکی میں پس رہی تھی۔ قوم کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وقت آگیا ہے کہ اس نظام کے معاشرتی روابط و اقدار کو نیست و نابود کردیا جائے جس نے انسان سے اُس کی انسانیت چھین لی ہے اور ایک ایسا نظام رائج کیا جائے، ایسے معاشرتی روابط قائم کیے جائیں جن میں انسان، انسان کا حریف نہیں بلکہ حلیف ہو اور جس کی بنیاد جمہوریت، مساوات اور سماجی عدل و انصاف پر ہو۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی نشاۃِ ثانیہ انہیں سماجی ہیجانات کا حسین پرتو تھی۔ اس نشاۃِ ثانیہ کے نقوش اُس زمانے کے افسانوں، ناولوں، نظموں میں، گیتوں اور گانوں میں، فلموں میں، تصویروں اور دستکاریوں میں غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں ملیں گے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اسی تہذیبی بیداری کا ایک پہلو ہے۔

لیکن اس نشاۃِ ثانیہ کی شعاعیں سرزمین دکن تک بہت چھن چھنا کر پہنچتی تھیں۔

وہاں تو اس وقت بھی قرونِ وسطیٰ کی گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور حیدر آباد پر کیا منحصر ہے کم و بیش تمام دیسی ریاستوں کا یہی حال تھا خواہ ان کے فرمانروا ہندو تھے یا مسلمان۔ اس سماجی پستی کے ذمہ دار بھی انگریز ہی تھے۔ انہوں نے دیسی ریاستوں کو اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر داخلی امور کی حد تک خود مختار بنا رکھا تھا۔ وہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں اس وقت تک بالکل مداخلت نہیں کرتے تھے جب تک پانی سر سے اونچا نہیں ہو جاتا تھا۔ یہ دیسی ریاستیں والیانِ ریاست کی جاگیر سمجھی جاتی تھیں۔ اُن میں باشندوں کو وہ شہری حقوق بھی حاصل نہ تھے جو برطانوی ہند کے باشندوں کو نصیب تھے۔ ریاستی باشندوں کے ساتھ شہریوں کا سا سلوک نہیں ہوتا تھا بلکہ والیِ ریاست کی رعایا سمجھے جاتے تھے یعنی بھیڑ بکریاں۔ وہ رعایا تھے اور والیِ ریاست راعی۔ راعی اور رعایا کا یہ پرانا تصوّر جاگیرداری دَور کے اُس رشتے کا عکس تھا جس میں ایک سرے پر حقوق ہی حقوق ہوتے تھے اور دوسرے سرے پر فرائض ہی فرائض۔ تمام حقوق راعی کے تھے اور تمام فرائض رعایا کے۔ چنانچہ حیدر آباد میں بھی کشمیر، راجپوتانہ، بہاولپور اور قلات وغیرہ کی طرح نظم و نسق کے کُل اختیارات نظام دکن اور ان کے نامزد کردہ وزیروں کو حاصل تھے۔ حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی جلسہ نہیں ہو سکتا تھا، کوئی جلوس نہیں نکل سکتا تھا، کوئی سیاسی جماعت نہیں بنائی جا سکتی تھی، نہ کوئی اخبار شائع ہو سکتا ہے، نہ کوئی شخص والیِ دکن اور ان کی حکومت کی مخالفت کی جرأت کر سکتا تھا۔ باشندوں کو رائے دینے کا حق نہیں تھا اور نہ ان کے چُنے ہوئے نمائندوں کی کوئی قانون ساز مجلس تھی۔ وزراءِ ریاست بادشاہ کے علاوہ کسی کے روبرو جواب دِہ نہ تھے۔ ریاست کا ایک تہائی رقبہ نظام دکن کی ذاتی ملکیت تھا۔ اُسے "صرفِ خاصِ مبارک" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس صرفِ خاص کی کُل آمدنی نظام کے ذاتی خزانے میں داخل ہوتی تھی۔ ریاست کی بنیاد زراعت پر تھی البتہ ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اُس زمانے میں اِکّا دُکّا فیکٹریاں بھی قائم ہونے لگی تھیں، مثلاً سوتی

کپڑے کی فیکٹریاں، سیمنٹ اور شیشے کی فیکٹریاں وغیرہ۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کا صدر مقام سکندر آباد تھا جو حیدر آباد شہر سے ملحق انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ سکندر آباد میں برطانوی ہند کا قانون نافذ تھا اس لیے وہاں ریلوے مزدوروں کی ایک یونین بھی موجود تھی۔ مخدومؔ نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا اسی یونین سے کی تھی۔ ریاست کی تمام آراضی جاگیرداروں میں بٹی ہوئی تھی۔ یہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر رہنے کی بجائے بلدہ (شہر حیدر آباد کو بلدہ کہتے تھے) میں رہتے اور عیش کرتے تھے۔

غرض کہ اس وقت کا حیدر آباد اور دوسری ریاستوں کی مانند قرونِ وسطیٰ کے "عہدِ زرّیں" کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اسی نام نہاد "عہدِ زرّیں" کا نقشہ مخدومؔ نے دھوآں، مشرقؔ، حویلیؔ اور روحِ فغفور میں کھینچا ہے۔ دھوآں نظامِ دکن کی تخت نشینی کی جوبلی کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ حویلیؔ ریاست کے سب سے بڑے جاگیردار نواب سالار جنگ کی حویلی سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ اس پرانی حویلی میں یوں تو صدیوں کے موروثی نوادر اور عجائبات جمع تھے لیکن تھی وہ بالکل اُجاڑ اور سنسان کیونکہ نواب کے آل اولاد نہ تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت یورپ کی سیر و تفریح میں صرف کرتے تھے۔ مخدوم کی نظر میں یہ حویلی زوال زدہ جاگیرداری نظام کی علامت بن گئی تھی۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر

مگر حیدر آباد دُنیا سے الگ تھلگ کوئی جزیرہ نہ تھا بلکہ ہندوستان کے بیچوں بیچ میں واقع تھا اس لیے برطانوی ہند میں جو سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکیں اٹھتی تھیں اُن کی گونج حیدر آباد میں بھی سنائی دیتی تھی۔ برطانوی ہند اور برطانیہ کے اخبارات، کتابیں

اور رسائل وہاں بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ اور دوسری درس گاہوں کا نصاب بھی قریب قریب وہی تھا جو برطانوی ہند میں رائج تھا چنانچہ دکن کے نوجوان بھی مغربی یورپ کی تاریخ، فلسفہ، اقتصادیات، ادب اور سائنس سے بخوبی واقف تھے۔ آزادیِ جمہوریت، شہری حقوق، مساوات، سماجی عدل و انصاف وغیرہ اُن کے لیے بھی اجنبی اصطلاحیں نہ تھیں چنانچہ ان کی آرزوؤں کا رُخ بھی رفتہ رفتہ اُدھر ہی ہوتا جاتا تھا جدھر برطانوی ہند کی نوجوان نسل کا تھا۔ ان کا ذاتی تجربہ بھی انہیں نئے سماجی تقاضوں کو قبول کرنے پر مجبور کر رہا تھا کیونکہ جس رفتار سے تعلیم بڑھ رہی تھی حصولِ معاش کے ذرائع اور ملازمتوں کی تعداد اُس رفتار سے نہیں بڑھ رہی تھی۔ برطانوی ہند کی مانند حیدر آباد میں بھی تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگاری کے ہاتھوں بہت پریشان تھے۔

البتہ حیدر آباد کا ایک انفرادی کردار بھی تھا جو وہاں کی ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں جھلکتا تھا۔ اظہارِ ذات کی فقط یہی ایک راہ تھی جو تعلیم یافتہ طبقوں پر بند نہیں ہوئی تھی چنانچہ جس طرح انیسویں صدی کے وسط میں جرمنی کے استبدادی دَور میں وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے نے فلسفے کے دامن میں پناہ لی تھی تاکہ شاہی عتاب و عقوبت سے بچ کر اپنے سیاسی اور سماجی خیالات کو فلسفے کی زبان میں بیان کر سکے، اُسی طرح حیدر آباد کے تعلیم یافتہ نوجوان زندگی کی کڑی دھوپ کا سفر ادب کے سائے میں کر رہے تھے۔ علم و ادب کا چرچا جتنا حیدر آباد میں تھا اتنا شاید ہی کسی دوسرے شہر میں ہو۔

مخدوؔم محی الدین کا شعور اسی فضا میں بیدار ہوا۔ آغازِ شباب میں جذباتی ہیجان کے باعث رومانوی کیفیت کی جو اُفتاد سب پر پڑتی ہے اس کا مزا مخدوؔم نے بھی چکھا چنانچہ انہوں نے بھی اسی نوع کے اشعار کہے۔ ٹیگور کی شاعری پر ایک کتاب شائع کی۔ ڈراموں میں اداکاری کی اور کئی ڈرامے بھی لکھے۔ ان کا سب سے اچھا ڈرامہ پھول بن تھا جو حیدر آباد میں بہت مقبول ہوا۔ یہ ڈرامہ چیخوف کے ڈرامے CHERRY

ORCHARD کا چربہ تھا جسے دکنی ماحول کے مطابق ڈھالا گیا تھا۔ چیخوف نے اپنے ڈرامے میں ایک جاگیر دار خاندان کا زوال اور ایک اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے۔ جاگیر کی مالک ایک بیگم صاحبہ ہیں جن کا بال بال مقروض ہے مگر انہیں اپنے پھول بن سے بڑی محبت ہے بالآخران کی ساری جائیداد سرمایہ دار کے قبضے میں چلی جاتی ہے اور جب بیگم صاحبہ اپنے پھول بن کا ماتم کرتی ہیں تو سرمایہ دار بڑی بے دردی سے کہتا ہے میں اس پھول بن کو کاٹ کر یہاں کارخانے قائم کروں گا۔

اس ڈرامے میں ایک انقلابی طالبِ علم کا کردار بھی ہے جو ایک روشن مستقبل کا خواب دیکھتا رہتا ہے مگر ہنوز اس میں اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت نہیں ہے۔ مخدوم نے ڈرامے میں اسی نوجوان کا کردار ادا کیا تھا۔

اس ایمائی ڈرامے اور پھر اپنے لیے انقلابی نوجوان کے کردار کا انتخاب ظاہر کرتا ہے کہ مزاج کے رومانی دور میں بھی مخدوم کے شعور کی سمت کیا تھی اور وہ کس قسم کے سماجی نظام کا خواب دیکھ رہے تھے۔

اسی اثنا میں برطانوی ہند میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک نے غالب، سرسید، حالی، آزاد اور اقبال کے ادبی اقدار کی بنیاد پر نئی ادبی اقدار کی عمارت تعمیر کی۔ اس تحریک نے اُردو ادب کو ایک نئے طرزِ فکر و احساس سے آشنا کیا اور ایک نئی زبان، نیا لہجہ عطا کیا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کا مقصد زندگی کی حقیقتوں کو حسی تجربوں کی آنچ میں پکا کر فن کے پیرائے میں قاری تک پہنچانا تھا۔ ترقی پسند ادب زندگی کی ترجمانی بھی کرتا تھا اور تنقید بھی۔ ہمارے معاشرے میں جبر و اختیار، آزادی اور غلامی، سرمایہ اور محنت، رئیس اور دہقان، ظلم اور انصاف، اطاعت اور بغاوت، افلاس اور دولت، جہل اور علم، عقل اور توہم، ترقی اور زوال، ماضی اور مستقبل، زندگی اور موت کی قوتوں کے درمیان جو آویزش جاری تھی ترقی پسند ادب اُس کا نہ صرف جائزہ لیتا تھا بلکہ اس آویزش

میں حق اور صداقت کی حیات بخش قوتوں کا ساتھ بھی دیتا تھا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو ابتدا ہی سے ملک کے قریب قریب سبھی نامور ادیبوں کی حمایت حاصل تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ ترقی پسند ادیب انہیں کے اقدارِ حیات کی نئی تعبیر پیش کرتے تھے چنانچہ مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، رابندر ناتھ ٹیگور، منشی پریم چند، مسز سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا غلام رسول مہر، فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری، سب نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا خیر مقدم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک ملک کی سب سے طاقتور اور فعال ادبی تحریک بن گئی۔ وہ سارے نوجوان ادیب جن کا شمار اب بزرگانِ ادب میں ہوتا ہے مثلاً فیض احمد فیض، کرشن چندر، سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، قتیل شفائی، پروفیسر احمد علی، پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، ظہیر کاشمیری، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، پروفیسر ممتاز حسین، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری اور مرزا ادیب اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ نوجوان ادیبوں کی ایک قوسِ قزح تھی جو اُردو زبان کے اُفق پر دیکھتے ہی دیکھتے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی مگر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ان ادیبوں کی شرکت اتفاقی امر نہ تھا اور نہ کوئی سازش تھی بلکہ نوجوان ادیبوں کو اس تحریک میں اپنے خیالات اور جذبات کا عکس نظر آتا تھا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک جس سُرعت سے ملک میں پھیلی اُسی شدت سے اس کی مخالفت بھی ہوئی چنانچہ حکومتِ ہند اور اس کے ہواخواہوں نے تحریک کو بدنام کرنے اور لوگوں میں ترقی پسند ادیبوں کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا لیکن تحریک اپنی چند ایک خامیوں اور ناتجربہ کاریوں کے باوجود آگے بڑھتی چلی گئی۔

مخدومؔ حیدر آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ آخر وقت تک اس سے وابستہ رہے۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کے اقدار کو اپنے کلام میں بڑے خلوص، سلیقے اور شائستگی سے سمویا ہے اور ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اشعار خواہ وہ عشقیہ ہوں یا فکری ترقی پسند ادب کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔

مخدومؔ کی شاعری کی عمر قریب قریب ۳۵ سال ہے لیکن ان کے اشعار کا مجموعہ بہت مختصر ہے۔ وہ سال میں مشکل سے تین چار نظمیں یا غزلیں کہتے تھے۔ اس کم سخنی کا سبب یہ ہے کہ وہ پیشہ ور شاعر نہ تھے بلکہ انقلابی رہنما تھے۔ شاعری کی حیثیت اُن کی زندگی میں ثانوی تھی اور وہ شعر اُسی وقت کہتے تھے جب کسی سانحے یا واقعے سے (جس کا تعلق کبھی غمِ زمانہ سے ہوتا تھا اور کبھی غمِ ذات سے) ان کے دل کے تاروں پر گہری چوٹ لگتی تھی۔ اس وقت وہ بے قرار ہو جاتے تھے اور جب یہ کیفیت ہوتی تو وہ بھرے مجمعے میں بھی شعر کہنے کے لیے کوئی گوشہ نکال لیتے تھے۔

مخدومؔ نے شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے کیا لیکن ان کی رومانی نظموں کی جڑیں بھی دکن کی زمین میں پیوست ہیں اور ان سے دکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے مثلاً طور، جہاں مخدومؔ نے محبت کے سبق کی ابتدا کی تھی۔ اس نظم میں مخدومؔ نے محبت کا بڑا معصوم، بڑا پاکیزہ تصور پیش کیا ہے۔

دِلوں میں اژدھام آرزو، لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی، دَم اُلفت کا بھرتے تھے
خُدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں، پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

یہ گھلاوٹ، نرمی اور مٹھاس مخدومؔ کی غنائیہ شاعری میں اب تک باقی ہے۔

البتہ ان کے ابتدائی دور کی سماجی شاعری کے تیور بڑے جلالی ہیں۔ لہجہ بڑا

رجزیہ، بڑا خطیبانہ اور مزاج ایک حد تک نراجی لیکن بڑی توانائی، بڑی گھن گرج، بڑی جھنجلاہٹ، بڑی تلخی اور نفرت ہے اُن کے اس عہد کے کلام میں۔ آگ، خون، دھواں، موت، لاش، کفن، اس جلالی شاعری کی علامتیں ہیں۔

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دُنیا سے جو دنیا ہے یہی

لیکن مخدوم یہ بھی جانتا ہے کہ تخریب کے انہی ملبوں پر جہانِ نو کی عمارت کھڑی ہوگی۔

دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انساں کو اب آزاد کیا جائے
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اِک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

"سرخ سویرا" کی آخری نظموں کے اندر نفی اور اثبات کا ایک لطیف توازن ملتا ہے۔ جذبات کے اظہار میں ایک ٹھہراؤ آگیا ہے۔ مشاہدۂ حق کی گفتگو میں ایمائیت کی آمیزش سے ایک رچاؤ پیدا ہو گیا ہے اور شعور میں پختگی اور گہرائی آگئی ہے۔ مثلاً اپنی نظم قمر میں مخدوم نے زندگی کی گھناؤنی حقیقتوں کو قدرت کے ایک حسین منظر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

یہ کس غریب کے سینے میں ہوک اُٹھی ہے
لرز رہے ہیں محل، تھر تھرا رہا ہے قمر
اداس رات ہے، افلاس ہے، غلامی ہے
کفن سے منھ کو نکالے ڈرا رہا ہے، قمر

کہاں ہے ساقیِ گل رُو، کہاں ہے "سرخ شراب"
فسانۂ غمِ گیتی سُنا رہا ہے قمر

فنّی اعتبار سے سُرخ سویرا کی سب سے کامیاب نظم اندھیرا ہے۔ یہ نظم دوسری جنگِ عظیم کے سامراجی دَور میں لکھی گئی تھی۔ اس کا مقابلہ اگر مخدوم کے ابتدائی زمانے کی نظم "جنگ" سے کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ چار پانچ سال کی مختصر مدت میں مخدوم کے احساس و آگہی نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ "جنگ" کی ابتدا اِس گھن گرج سے ہوتی ہے۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

اس کے برعکس سامراج نے زندگی پر جو شب خون مارے ہیں اُن کی فردِ جرم اندھیرا میں بڑے پیغمبرانہ خود اعتمادی سے مرتب کی گئی ہے۔

رات کے ہاتھ میں اِک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی اُن کا کفن
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مخدوم کی پہلی آزاد نظم بھی یہی ہے۔

مخدوم کا دوسرا مجموعہ "گلِ تر" درحقیقت ایک مہکتا ہوا پھول بن ہے (جس میں سرخ سویرا کا کلام بھی شامل ہے) اس مجموعے میں غزلیں اور غنائیہ نظمیں نسبتاً زیادہ ہیں۔

"گلِ تر" کی دو نظمیں..... "چاند تاروں کا بن" اور "چپ نہ رہو"، اس حسی تجربے کا نقطۂ عروج ہیں جس کا اظہار مخدوم نے اپنی نظم اندھیرا میں کیا تھا۔ "چاند تاروں

کا بن "حریت پرستوں کے خونِ آرزو کی رزمیہ داستان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔
ابھی تو راستے میں غم کی دیواریں کھڑی ہیں اور پرخار وادیاں آبلہ پاؤں کی منتظر ہیں۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن

رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن

رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے

اور جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو

رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو

جوئے خوں بن گیا

کچھ امامانِ صد مکر و فن

اک کمیں گاہ سے

پھینک کر اپنی نوکِ زباں

خونِ نورِ سحر پی گئے

لیکن تشنہ لبانِ آزادی مایوس اور شکستہ دل نہیں ہیں۔

ہمدمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

رات، اندھیرا اور چاند تارے مخدوم کی محبوب علامتیں ہیں چنانچہ، ''چپ نہ رہو''، میں بھی جو لومبا کے قتل پر لکھی گئی تھی نظم کا آغاز رات کے اندھیرے ہی سے ہوتا ہے۔

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا

مخدومؔ تمام عمر محنت کشوں کی جدوجہد میں مصروف رہا لیکن وہ مردِ انقلاب تھا، اقبالؔ کا مردِ مومن نہ تھا جسے نہ ہنسی آئے نہ رونا، جو نہ خوش ہو سکے نہ اُداس، جس نے نہ کبھی محبت کی ہو نہ پیار۔ مخدومؔ کے دردمند دِل میں تو انسان اور انسانیت دونوں سے محبت کی بے پناہ گنجائش موجود تھی۔ مخدوم کے مذہبِ عشق میں محبت ایک حیات آفریں اصول بھی تھا اور ایک دلکش جذبہ بھی۔ مگر اس کے کلام میں اصول اور جذبہ دو الگ خانوں میں بٹے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اس کا تخیّل دونوں کی آمیزش سے محبت کو ایک روحانی مسرت بنا دیتا ہے۔ مخدومؔ کو جتنا یقین اپنے اصولِ زیست پر ہے اتنا ہی اعتماد اپنے جذبۂ عشق کی صداقت پر ہے۔ اس صداقت کا اظہار اس نے ہمیشہ بڑے خلوص، بڑی شدت سے کیا ہے۔ احتیاطِ وضع سے اس کا وم کبھی نہیں رُکا بلکہ اس نے جو محسوس کیا اُسے پوری جرأت اور بے باکی سے نظم کر دیا۔ مخدومؔ کی محبت فرضی یا خیالی نہیں ہے بلکہ ایک زندہ اور حقیقی شے ہے اِسی لیے اس کی غزلوں اور نظموں میں بڑا گداز، بڑی سچائی ہے۔ مخدومؔ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جن کے چاہنے والے اُن کو بُت بنا کر پوجتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عاشقانہ کلام میں نالہ و فریاد کا عنصر سرے سے غائب ہے۔ جدائی کا غم اسے بھی ستاتا ہے۔ محبت کی مجبوریوں پر اُس کا دِل بھی کڑھتا ہے مگر ناکامیاں اور نامرادیاں مخدومؔ کا تجربہ نہیں ہیں اس لیے وہ روایتی شاعروں کی طرح نہ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کرتا ہے اور نہ اغیار کے بختِ رسا کو طعنے دیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے

محبوب کا ذکر ہمیشہ بڑے پیار سے اور بہت خوش ہو ہو کر کرتا ہے۔

جہاں بھی بیٹھے ہیں، جس جا بھی رات سے پی ہے
انہیں کے آنکھوں کے قصے، انہیں کے پیار کی بات
اُن کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے
یوں چلے جیسے شرابی کا خرام آہستہ
جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے
ہجومِ بادہ و گل ہیں، ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

مخدوم کو اپنی ہی محبت عزیز نہیں ہے بلکہ وہ دوسروں کی محبت کا بھی احترام کرتا ہے اور دوسروں کے آلامِ محبت سے بھی اُس کو دکھ پہنچتا ہے۔

اِک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چِتا
دو بدن

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی رات پھولوں کی
آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی

آخر میں مخدوم کے چند لافانی اشعار ملاحظہ ہوں جو اپنی آفاقی صداقتوں کے باعث ہماری زبان کے محاورے بن گئے ہیں۔

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
ہم اپنے ایک دِل بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ
تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہ کن کی جیت ہو
ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جُرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب
اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اُڑیں، گل کو ہمکنار کریں

مخدوم اُن خوش نصیب شاعروں میں ہے جن پر اُن کی زندگی ہی میں پیار اور محبت کے پھول برستے رہے۔ یہ پھول آج بھی تازہ ہیں۔ مخدوم ہم میں موجود نہیں مگر وہ اپنے کلام میں آج بھی زندہ ہے اور سدا زندہ رہے گا کیونکہ سچائی کبھی نہیں مرتی۔

پیمانِ وفا کی تجدید

وقت کسی سے نفرت کرتا ہے نہ محبت،
وہ کسی سے رعایت بھی نہیں کرتا،
وہ پیدا بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے،
اور جب ساری دنیا سو جاتی ہے وہ تب بھی جاگتا رہتا ہے۔
وقت باقی، بقیہ ہر شے فانی ہے،
جوانی، حُسن، زندگی، تندرستی،
دولت، دوستی کسی کو ثبات نہیں،

(مہابھارت)

رِپ وان وِنکل کا قصہ آپ نے سُنا ہوگا۔ موصوف کو کام کاج سے بالکل دلچسپی نہ تھی، بس سارا وقت بیٹھے بچوں کو جن پریوں کی کہانیاں سناتے رہتے تھے۔ گھر والے اُن کے نکھٹوپن سے عاجز تھے۔ ایک دن بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تو موصوف نے خفا ہو کر جنگل کی راہ لی۔ وہاں ان کو چند بونے ملے جو بیٹھے دارو پی رہے تھے۔ انہوں نے رپ

وان ونکل کی خوب خاطر تواضع کی اور جب رپ وان ونکل مدہوش ہو کر سو گیا تو بونے غائب ہو گئے۔ رپ وان ونکل سو تا رہا، سو تا رہا، یہاں تک کہ بیس سال گزر گئے۔ آنکھ کھلی تو سر کے بال شانوں تک بڑھ آئے تھے۔ داڑھی نے سینے پر سایہ کر لیا تھا اور ناخن انگلیوں کے برابر لمبے ہو گئے تھے۔ رپ وان ونکل بہت حیران ہوا۔ گاؤں واپس آیا تو کتے اس کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ بچوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں مگر کسی نے رپ وان ونکل کو نہ پہچانا...... بیٹی نے بھی نہیں کہ اب بڑی ہو کر کئی بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

رِپ وان وِنکل بیس برس کے بعد گھر لوٹا تھا اور میں ۳۵ برس کے بعد اپنے منھ بولے وطن حیدر آباد جا رہا تھا (اکتوبر ۱۹۸۰ء) رِپ وان وِنکل نے بیس سال سو کر گزارے تھے مگر میں نے ۳۵ سال بہ قائمیِ ہوش و حواس دیس پردیس میں بسر کیے تھے۔ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو طویل مفارقت کے بعد اپنے کسی محبوب سے ملے ہوں۔

دہلی سے حیدر آباد تک کا مختصر سفر نہ پوچھیے کس اضطراب میں گزرا۔ ہوائی جہاز میرے جذبات سے بے خبر ہوا کا سینہ چاک کرتا، فراٹے بھرتا شہرِ نگاراں کی جانب بڑھتا جا رہا تھا اور میرے دل میں طوفان برپا تھا۔ یادوں کے شب چراغ کبھی جلتے کبھی مدھم ہو جاتے۔ یہ اخبار "پیام" کا دفتر ہے۔ یہ قاضی عبد الغفار ہیں، یہ میرا پیارا دوست مخدوم ہے۔ دل فگاروں اور دل نوازوں کا چہیتا، نازنینوں اور ناز برداروں کا منظورِ نظر اور دکن کی بے چین روح کی شاعرانہ علامت، یہ بلبل ہند کا "آستانۂ زرّیں" ہے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی تھی۔ دل کہتا کہ مانا حیدر آباد اب ان ہستیوں سے خالی ہے مگر وہ جو حیات ہیں کیا ۳۵ سال کی طویل مدت میں ان کے مزاج اور طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو گی۔ کیا وہ مجھ کو پہچان لیں گے۔ ملاقات کا جو اشتیاق مجھے کشاں

کہاں لیے جا رہا ہے کیا وہ اس کی شدت کو محسوس کر سکیں گے اور کیا زمانہ میری خاطر پیچھے دوڑے گا۔ کیا دلوں کی قربت فاصلے کی طنابوں کو توڑ سکے گی؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ اگر اس دیارِ حسن نے جہاں میں نے "محبت کے سبق کی ابتدا کی تھی" مجھ کو بیگانہ سمجھا تو؟ میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ جہاز کے عملے کی طرف سے پیٹی باندھنے اور کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھنے کا اعلان ہو گیا۔ میں کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔ شوقِ دید درختوں، پہاڑوں اور تالابوں سے اپنے شکوک آمیز سوالوں کا جواب طلب کر رہا تھا لیکن بدلتے منظر کے یہ خاموش تماشائی مجھ کو کچھ نہ بتا سکے۔

میں جانتا تھا کہ ہوائی اڈے پر دوستوں میں سے کوئی نہ ملے گا کیونکہ میں معینہ تاریخ سے ایک دن بعد پہنچ رہا تھا، پھر بھی مشتاق نظریں اجنبیوں کے ہجوم میں یاروں، آشناؤں کو تلاش کر رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ کاش کوئی جان پہچان ہی کا مل جائے تو دل کی دھڑکن کچھ کم ہو لیکن مایوسی ہوئی۔ سامان لے کر باہر نکلا تو ادھیڑ عمر کا ایک ٹیکسی والا میری طرف بڑھا۔ اس کے چہرے بشرے سے پتہ چل رہا تھا کہ خالص حیدر آبادی ہے۔ مجھ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ بے اختیار اس سے بغل گیر ہو گیا۔ وہ پہلے حیران ہوا پھر مسکرانے لگا۔ میں نے نادم ہو کر معافی مانگی تو وہ خالص دکنی لہجے میں بولا۔ "کوئی بات نہیں جناب، آپ گلے ملے ہیں گالی تو نہیں دی ہے۔ کہاں جائیے گا؟" میں نے کہا "حمایت نگر میں ایک جگہ مخدوم بھون ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں؟" ہنس کر بولا۔ "کیوں نہیں جناب مقدوم بھون، تو ہمارا اپنا ہے، اُس کو نہ جانیں گے۔"

صبح کا وقت تھا اور دہلی کی شدید گرمی کے بعد دکن کا خوش گوار موسم بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ موٹر پوری رفتار سے فاصلہ طے کر رہی تھی اور میں سڑکوں کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اتنے میں حسین ساگر دکھائی دیا اور یادوں کی شہنائیاں بجنے لگیں۔ پیار کی چاندنی، مہکتے پھولوں کی خوشبو، ساڑھی کے پلّوؤں کا ہوا میں رقص، دھیمی

رٹے میں دکن کے گیت، حافظ خیالی فانوسوں کی روشنی سے جگمگانے لگا۔ کٹے کی سڑک اب پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گئی تھی۔ کٹے کے نشیب میں باغیچے اور بچوں کے جھولے بھی نئی چیزیں تھیں، البتہ سڑک کی بائیں جانب جگہ جگہ اشتہاروں کے بھونڈے سائن بورڈ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔ نہ جانے تاجرانہ ذہنیت کو حسن سے اتنا بیر کیوں ہے۔ غالبؔ نے غالباً بازاری ذہنیت ہی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مگر سرمایہ داری نظام میں شاید گل ہی پر کیا منحصر ہے، انسانیت، اخلاق، مروّت، محبت، دوستی، ادب سب بازاری مال ہوگئے ہیں۔ البتہ بھوکا اگر چاند، سورج کو دیکھ کر کہے کہ ۔

"بابا مجھے تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں"

تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن مال داروں کی بدمذاقی کا کیا جواز ہے؟

(۲)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی اور اُن ہی کی دعوت پر میں حیدر آباد جا رہا تھا۔ یہ حضرت کسی زمانے میں دُبلے پتلے نوجوان طالبِ علم ہوتے تھے اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے روحِ رواں۔ اب کے دیکھا تو دہرا جسم، بال کھچڑی، کسی کے دادا، کسی کے نانا مگر تیزی طراری اور پھُرتی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پہلے یار دوستوں کے محبوب تھے۔ اب ان کا شمار ملک کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ سیاسی لیڈر بھی ہیں اور اُردو کے معروف ترقی پسند ادیب بھی۔ ملتے ہی ڈانٹنے لگے کہ کل تمہارے عاشقوں کی فوج لے کر ایئرپورٹ گیا تھا اور گالیاں دیتا واپس آیا۔ اچھا ان سے مِلو، یہ پروفیسر نرسنگھ راؤ ہیں تمہارے پرانے دوست نرسنگ راؤ (ایڈیٹر ہفت روزہ "رعیت") کے بھتیجے اور

شہاب الدین کے یار۔ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کلب میں کیا تھا۔ سردار جعفری اور کیفی وہیں ٹھہرتے ہیں مگر نرسنگھ کی حیدر آبادی ناک بہت لمبی ہے۔ کہتے ہیں کہ تیس چالیس لاکھ کے شہر میں کیا ایک گھر بھی نہیں جس میں پاکستانی مہمان کے لیے ایک چارپائی بچھ جائے۔ آج سے یہ تمہارے میزبان اور تم ان کے مہمان۔ میں چلا۔ ہماری یونین کے آٹھ دس آدمیوں کو پولیس نے بلاوجہ پکڑ لیا ہے۔ اُن کو ضمانت پر رہا کروانا ہے......اور وہ مجھ کو نرسنگ راؤ کے حوالے کر کے یہ جا وہ جا۔

نرسنگ راؤ طالب علمی کے زمانے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری رہ چکے تھے۔ تلنگانہ تحریک کے سلسلے میں گرفتار بھی ہوئے مگر اب انوار العلوم کالج میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔ کہنے لگے گھر چلتے ہیں لیکن ذرا شہاب کو لے لیں۔ سامان گاڑی میں رکھا گیا اور موٹر حمایت نگر سے مغل پورہ کی سمت روانہ ہو گئی۔ راستے میں عابد روڈ سے گزرے، میں نے پہچان لیا۔ یہ ویکاجی ہوٹل ہے جس میں میں نے کچھ دن قیام کیا تھا۔ یہ معظم جاہی مارکیٹ ہے۔ میں نے پہچان لیا، پھر موسیٰ ندی کا پُل آیا اور اس کے کنارے واقع آصفی دور کی عالیشان عمارتیں نظر آنے لگیں۔ عثمانیہ ہسپتال، کتب خانۂ آصفیہ، ہائی کورٹ، پتھر گٹی، چار کمان، مسجد اور چار مینار سب جانے پہچانے تھے۔

شہاب الدین حیدر آباد میں میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ اس سے آخری ملاقات ۳۵ برس گزرے بمبئی میں ہوئی تھی جب میں امریکہ جا رہا تھا اور شہاب ریلوے اسٹیشن پر مجھ کو رُخصت کرنے آیا تھا۔ خط و کتابت کا وہ چنداں قائل نہیں البتہ مرزا ظفر الحسن یا اُن کی بیوی حمیدہ حیدر آباد سے جب کراچی واپس آتے تو ان سے شہاب کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ شہاب سے مل کر جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوصف اُس میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ نہ تن و توش میں نہ عادات و اطوار میں۔ وہی بوٹا سا مائل بہ فربہی قد، وہی سر کے سیاہ بال

اور چہرے پر وہی بے فکری اور شادابی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ کاروبارِ زندگی سے اس کو کبھی دل چسپی نہ تھی، دولت و ثروت کو وہ کبھی خاطر میں نہ لایا، بال بچوں کا جھمیلا اس نے کبھی پالا نہیں کہ اس سے آزادی میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا۔ کتابیں جمع کرنا، کتابیں پڑھنا اور آرام کرنا شہاب کے من بھاتے مشاغل ہیں اور وہ اس دیرینہ روایت کو بڑی وضعداری سے نبھا رہا ہے۔ مخدوم کہا کرتا تھا کہ شہاب کی سب کتابیں حشر کے دن پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر اپنے مالکوں کی گود میں گریں گی مگر اس کاہل اور گوشہ نشیں انسان میں نہ جانے کیا کشش ہے کہ ہر شخص اس کو پیار کرتا ہے۔ شاید اس کا خلوص اور بے غرض ملنا جلنا ہی لوگوں کو اس کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ہندوستان، پاکستان، دونوں ملکوں میں ایک نہایت بیہودہ بلکہ توہین آمیز دستور پولیس میں اندراج کا ہے۔ یہ برتاؤ فقط ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے مخصوص ہے (کسی اور ملک کے باشندے کو ہندوستان یا پاکستان میں یہ ذلت برداشت نہیں کرنی پڑتی)۔ بستہ بند اور پیشہ ور غنڈوں، بدمعاشوں کی طرح اپنے آنے جانے کی رپورٹ پولیس کے دفتر میں لکھوانی ہوتی ہے اور وہ بھی ۲۴ گھنٹے کے اندر ورنہ خود اندر۔ پولیس کمشنر کا دفتر شہاب کے گھر کے پاس تھا لہٰذا میں نے کہا کہ اس کارِ خیر سے بھی لگے ہاتھوں کیوں نہ سبک دوش ہو لیا جائے۔ نرسنگ نے کہا یار چھوڑو بھی، یہ حیدر آباد ہے دہلی نہیں، یہاں کس کی مجال ہے جو تم سے باز پُرس کرے مگر میں نہ مانا۔ خیر صاحب پولیس کمشنر کے دفتر میں حاضری دی۔ ساڑھے دس بج چکے تھے لیکن دفتر میں سناٹا تھا۔ اسسٹنٹ پولیس کمشنر تو موجود تھے البتہ عملہ غائب تھا۔ اُن سے رجوع کیا۔ بڑے اخلاق سے اٹھ کر ملے۔ ہم نے حاضری کی غرض بیان کی تو معذرت کرتے ہوئے بولے، جناب! آج دسہرہ ہے اور کل بقر عید۔ پرسوں آجایئے۔ میں نے کہا مگر جناب حکم تو یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر حاضری لگواؤ۔ ہنس کر کہنے لگے بس آپ کے درشن ہو گئے یہی رپورٹ ہے، اب جس دن

جی چاہے آجایئے گا۔ باہر نکلے تو زسنگ نے بڑے فاخرانہ انداز میں کہا "ہم نہ کہتے تھے کہ یہ حیدر آباد ہے دہلی نہیں ہے۔" شہاب نے لقمہ دیا۔ "کام آرام سے کرنا چاہیے جلد بازی سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔"

ہاں، یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ موٹر شہاب کے گھر پہنچی تو پھاٹک اندر سے بند تھا۔ شور مچایا تو کسی بچے نے پھاٹک کھولا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی شہاب الدین صاحب، ایم اے عثمانیہ برآمدے میں بیٹھے ایک صاحب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں۔ اُٹھ کر گلے ملے، شکایت کی کہ تم نے صبح ہی صبح کل خواہ مخواہ ایئرپورٹ دوڑادیا لیکن ابھی گلے شکوے ختم نہ ہوئے تھے کہ شہاب ہم کو برآمدے ہی میں چھوڑ کر اندر غائب ہو گیا اور لوٹا تو ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافہ اس نے میری طرف بڑھادیا اس میں چھ، سات چھوٹے چھوٹے فوٹو تھے جو ۴۱ء، ۴۲ء میں اس وقت کھنچے تھے جب شہاب لکھنؤ آیا تھا۔ ان تصویروں میں شہاب ہے، مجازؔ ہے اور میں ہوں۔

ایک تصویر میں مجازؔ بڑے بانکپن سے شال اوڑھے اور کلاہ کج کیے بیٹھا ہے۔ مجازؔ کی اتنی پیاری تصویر میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یوں بھی یہ تصویر میرے لیے بڑی قیمتی تھی کیونکہ ہم اتنے دن ساتھ رہے مگر نہ مجازؔ کے ساتھ میری کوئی تصویر ہے نہ شہاب کے ساتھ۔ جوانی کی ان تصویروں کو دیکھ کر میرے منھ سے بے ساختہ نکلا کہ یار جوانی میں ہم لوگ کتنے خوبصورت تھے۔ شہاب نے فوراً چوٹ کی۔ بولا: "مجازؔ اور میں تو خیر خوبصورت تھے مگر آپ اپنے کو بھی خوب صورتوں میں شامل کرتے ہیں؟"

یہ تصویریں میں نے راج بہادر کو دکھائیں تو انہوں نے کہا مجھ کو دے دو۔ میں ان کی کاپیاں بنوادوں گا مگر اُن کے فوٹوگرافر صاحب نے میرے وہاں ہوتے تصویروں کی نہ کاپیاں بنائیں نہ اصل تصویریں واپس کیں۔ کئی مہینے کے بعد راج نے ڈاک سے بھجوائیں۔

نرسنگھ راؤ کا بنگلہ بنجارہ ہل پر ایک پُر فضا پہاڑی کے دامن میں واقع ہے البتہ بنگلے کے سامنے اور بازو میں دو عجیب سے قبرستان ہیں جن میں رنگ برنگی پختہ قبریں بنی ہیں۔ میں نے نرسنگھ سے پوچھا کہ یہ قبریں کس کی ہیں۔ بولے ہمارا دیس پرانی قوموں کا گہوارہ ہے۔ یہ قومیں تمہارے موہن جو دڑو اور ہڑپہ کی رشتہ دار ہیں اور قبرستان ایسی ہی کسی قوم کے ہیں۔ جس زمانے میں یہ جگہ سنسان، ویران ہوتی تھی اور بنجارے یہاں آکر ڈیرے ڈالتے تھے تو وہ اپنے مُردوں کو یہیں دفن کرتے تھے، اب یہ علاقہ بیچوں بیچ شہر میں آگیا ہے لیکن قبروں کو کون ہٹائے۔ زندوں کی جھونپڑیاں ہوتیں تو فوراً اُٹھوا دی جاتیں لیکن مُردوں کو کس دل سے چھیڑا جا سکتا ہے۔ ہم کو زندوں کے آرام آسائش کی پروا نہیں ہوتی مگر مُردوں کا احترام ہماری تہذیب میں داخل ہے۔ میں نے کہا تم اپنا لیکچر بند کرو اور مجھ کو اس قوم کے بارے میں بتاؤ۔ نرسنگھ نے کہا کہ یہ پیگن (PAGAN) لوگ ہیں، نہ ہندو نہ مسلمان۔ وہ سال میں دو بار جمعرات کے دن یہاں آتے ہیں، قبروں کی صفائی کرتے ہیں، ان کو رنگتے ہیں، کڑھائیاں چڑھاتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، شام کے وقت قبروں پر دیے جلاتے ہیں اور پھر کھا پی کر چلے جاتے ہیں۔ نرسنگ نے کہا کہ قبرستان کی وجہ سے اس مکان میں مالکِ مکان نہ کبھی خود رہے اور نہ کوئی اس کو خریدتا تھا بلکہ مشہور ہو گیا تھا کہ اس میں بھوت ہیں۔ گاہک آتے، دیکھتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ میں نے یہ مکان خریدا تو مالکِ مکان نے میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ جان چھوٹی۔ اب میں روز بھوتوں کا منتظر ہوں مگر ہم خود اتنے بڑے بھوت ہیں کہ چھوٹے موٹے بھوت اِدھر کا رُخ نہیں کرتے۔

حیدر آباد میں میرا قیام ایک ہفتے رہا لیکن یہ خوش گوار شب و روز پل جھپکتے گزر گئے۔ دوستوں اور کرم فرماؤں کے نرغے میں پتہ ہی نہ چلا کہ شام کب آئی اور صبح کب ہوئی۔ اس دوران نرسنگھ شاید ہی ایک دو روز کالج گئے ہوں۔ بس ہر وقت موٹر لیے مجھ کو

سیر کرواتے رہتے تھے۔ سیر کیا لوگوں سے ملواتے رہتے تھے پھر بھی افسوس ہے کہ کئی گھروں پر سلام کے لیے نہ جا سکا۔ میری وجہ سے ڈاکٹر مسز منگو ٹا نرسنگ راؤ کو کئی بار ٹیکسی پر آنا جانا پڑا۔ وہ صبح کے وقت سرکاری زنانہ اسپتال میں مریضوں کو دیکھتی ہیں اور شام کے وقت اپنا ذاتی مطب کرتی ہیں۔ ایک رات ہم لوگ کہیں پر عالمِ سرور میں بیٹھے دکنی ضیافت کے مزے لوٹ رہے تھے کہ نرسنگ کو اچانک بیوی یاد آ گئی۔ بولے، یار غضب ہو گیا۔ میں نے منگوٹا سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی میں تم کو لیتے چلیں گے مگر اب تو بہت دیر ہو گئی۔ میں نے کہا فوراً اٹھ چلو، شاید انتظار کر رہی ہوں، چنانچہ بھاگم بھاگ پہنچے تو دیکھا کہ مطب کھلا ہے اور ایک موٹر بھی باہر کھڑی ہے۔ نرسنگ اندر گئے تو منگوٹا بہن باہر آئیں اور مسکرا کر بولیں، ''مجھ کو معلوم تھا کہ حسیناؤں کی محفل میں تم لوگ مجھ کو بھول جاؤ گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں ایک بچے کو دیکھ رہی ہوں، اُس کے والدین مجھ کو گھر پہنچا دیں گے۔ تم لوگ جاؤ۔''

ڈاکٹر منگوٹا بچوں کی بے حد مقبول ڈاکٹر ہیں۔ گھر پر کسی مریض کو نہیں دیکھتیں حتیٰ کہ انہوں نے بنگلے پر اپنے نام کی تختی بھی نہیں لگوائی ہے، پھر بھی عورتیں چالیس چالیس میل سے بچوں کو لے کر بے وقت گھر پر آدھمکتی ہیں اور ڈاکٹر منگوٹا انکار نہیں کر پاتیں۔ کہتی ہیں کہ بیمار بچوں کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ مجھ کو اپنے بچوں کا بچپن یاد آنے لگتا ہے۔

(۳)

مجھ کو اُردو اکیڈمی نے پریم چند سیمینار میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ بہت فعّال سرکاری ادارہ ہے جس کا مقصد اُردو زبان و ادب کی اشاعت اور اُردو اربابِ قلم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اس قسم کی اُردو اکیڈیمیاں یوپی، بہار، بنگال، مہاراشٹر بلکہ قریب قریب ہر ہندوستانی ریاست میں قائم ہیں۔ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا دفتر ایک دو

منزلہ عمارت میں ہے۔ اُس کے ڈائریکٹر مسٹر سری واستو جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوان دانشور ہیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے۔ اکیڈمی کی سرگرمیوں کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اُردو اکیڈمی کی مطبوعات بھی عنایت کیں۔ وہیں جناب اختر حسن سے بھی ملاقات ہوئی جو مسٹر سری واستو کے رفیقِ کار ہیں۔ اختر حسن سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ وہ میرے بعد اخبار "پیام" سے وابستہ ہوئے تھے اور قاضی عبدالغفار مرحوم نے علی گڑھ جاتے وقت "پیام" انہیں کے سپرد کیا تھا۔ اختر حسن اُردو کے معروف ادیب بھی ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف۔ حال ہی میں انہوں نے غالبؔ کی مشہور مثنوی "ابرِ گہربار" کا منظوم اُردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا لیکن ابھی تک اس کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

اُردو اکیڈمی کے دفتر سے اُٹھ کر سیاستؔ کے دفتر عابد علی خاں سے ملنے گیا کہ ۱۹۴۵ء میں جب میں آخری بار حیدر آباد آیا تھا تو یہی صاحب جو اُس وقت صاحبزادے تھے انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد تھے اور انجمن کی اس تاریخی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں پیش پیش، جس کو کرشن چندر نے "پودے" میں اور سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ عابد علی خاں تو نہ ملے البتہ جگرؔ، احسن علی مرزا اور دوسرے کئی دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ عابد علی خاں نے اپنی اس عدم موجودگی کی تلافی بعد میں ایک پُرتکلف دعوت سے کر دی۔ کام و دہن کی لذت تو وقتی ہوتی ہے لیکن اُن کے لطف و عنایات کا نشہ ہنوز باقی ہے۔ وہیں عزیزم زاہد علی خاں نے سیاستؔ کی مطبوعات بھی عطا کیں۔ ان کتابوں میں مخدومؔ کے نثری مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ "ٹکی کے پیچھے لڑکا" بھی تھا، جس سے میں بالکل بے خبر تھا۔ دہلی اور حیدر آباد میں اُردو کی نئی نئی مطبوعات کی فراوانی دیکھ کر اپنی ناواقفیت کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ امریکہ یا انگلستان میں کوئی کتاب شائع ہو تو ساری دنیا کے انگریزی دانوں کو خبر ہو جاتی ہے لیکن اُردو بیچاری

اس سعادت سے محروم ہے اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قریبی ہمسایہ ہونے کے باوجود کتابوں اور رسالوں کی لین دین بند ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بیشتر اُردو مطبوعات سے پاکستان کے لوگ اور پاکستانی مطبوعات سے اہل ہند بے خبر رہتے ہیں۔ کاش کوئی سورما اس دیوار چین کو توڑ سکتا کیونکہ ان رکاوٹوں سے سراسر زیاں اُردو زبان وادب کا ہے۔

پہلی تقریب جس میں حیدر آباد کے ادیبوں سے ملاقات کا موقع ملا، انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے اُردو ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اُردو اکیڈمی کی مانند اُردو ہال بھی نئے دور کا ادارہ ہے۔ اس کے بانی ایک مخیر بزرگ حبیب الرحمٰن صاحب ہیں۔ یہ جائیداد تقسیمِ ہند سے پہلے خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی ملکیت تھی۔ انہوں نے پاکستان منتقل ہوتے وقت حبیب الرحمٰن صاحب کے ہاتھ بیچ دی تھی، اب حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ کئی ایکڑ زمین اُردو ہال کو دے دی ہے اور نام و نمود سے بے پروا بڑی خاموشی سے اُردو کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اُردو ہال کی عالی شان عمارت کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اُردو کالج بھی اسی احاطے میں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پہلی ملاقات جناب حبیب الرحمٰن سے ہوئی۔ وہ منتظمین کے ہمراہ باہر ہی کھڑے تھے۔ حیدر آباد کا روایتی لباس یعنی ترکی ٹوپی اور بند گلے کی شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ زیبِ تن تھا۔ نہایت دُبلے پتلے مگر بڑی بڑی روشن آنکھیں اور چہرے پر کہن سالی کے کوئی آثار نہ تھے۔

آندھرا پردیش کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمدِ عمومی ڈاکٹر حسینی شاہد ہیں۔ وہ اُردو کالج کے پرنسپل ہونے کے علاوہ پرانی دکنی اُردو کے ممتاز محقق اور ادیب بھی ہیں۔ اس تقریب کے مہتمم وہی تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جلسے میں پرانی نسل کے جانے پہچانے ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ نئی نسل کے ادیب بھی بڑی تعداد میں موجود

تھے۔ ہر شخص جاننا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کس حال میں ہے۔ میں نے پاکستان کے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا کہ ۵۳ء ۵۴ء تک ہماری انجمن پاکستان کی سب سے سرگرم ادبی تنظیم تھی۔ ملک کے اکثر و بیشتر ادیب انجمن سے وابستہ تھے اور مولوی عبدالحق، مولانا چراغ حسن حسرتؔ ایڈیٹر امروز، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دنیا اور مولانا غلام رسول مہرؔ ایڈیٹر انقلاب کے سے بزرگ بھی تحریک کی حمایت کرتے تھے بلکہ ۱۹۵۳ء میں انجمن کی جو کانفرنس کراچی میں ہوئی تھی اس کی صدارت مولوی عبدالحق مرحوم نے کی تھی البتہ ۱۹۵۴ء میں جب امریکہ کا عمل دخل بڑھ گیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا اور لاہور، کراچی، ملتان، حیدر آباد اور پشاور میں انجمن کی جو ہفتہ وار بیٹھکیں ہوتی تھیں وہ بند ہو گئیں، اس طرح تنظیم باقی نہ رہی لیکن ادب میں ترقی پسند رجحانات انجمن سے پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی ادیبوں میں غالب رجحان یہی ہے۔ بیشتر ادیب گرد و پیش کی زندگی کی تنقید کی جانب مائل ہیں اور معاشرے سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی ہمہ گیری کا اعتراف اس کے مخالفوں کو بھی ہے۔ چنانچہ سرکار پرست نقّاد سلیم احمد نے حال ہی میں جماعتِ اسلامی کے اخبار جسارتؔ میں اپنے ہم خیال ادیبوں کو بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات حُسنِ قبول سے محروم ہیں۔ وہ نہ فنّی محاسن کے اعتبار سے ترقی پسند ادیبوں کی ہمسری کر سکتی ہیں اور نہ ان میں وہ حقیقت شناسی، حسیّت اور خلوص کی حرارت پائی جاتی ہے جس کے باعث ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں آج بھی زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

ہیئت کے نئے تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ہیئت کے تجربے ہر دور میں ہوئے ہیں، نئی نئی علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، نئے حسّی تجربے کے لیے [illegible] اظہار [illegible] کا نیا انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان رواں دواں زندگی

کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہی ہے البتہ ہیئت کے تجربوں کی آڑ لے کر قاری کو چونکانے یا مرعوب کرنے کی خاطر بے مقصد اور بے معنی مہمل ادب تخلیق کرنا ادب کی خدمت نہیں ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ جدیدیت کے نام پر اس قسم کے تجربے وہی ادیب کر رہے ہیں جن کا کوئی واضح نصب العین نہیں ہے یا جو یاسیت، شکست خوردگی، تنہائی اور بے چارگی کا شکار ہیں۔ ان ادیبوں کا انسانیت پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی ذات ہی کو کائنات سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے ذاتی آلام و مصائب کا رشتہ غمِ زمانہ سے نہیں جوڑ پاتے۔ یہی آلام و مصائب ترقی پسند ادیبوں کو بھی ہیں مگر فیضؔ، حبیب جالبؔ اور احمد فرازؔ وغیرہ کے کلام میں نہ مردم بیزاری کے آثار ملتے ہیں نہ بے بسی، ہزیمت اور تنہائی کا احساس پایا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی تقریب میں موضوعِ گفتگو اُردو کی ترویج و ترقی تھا۔ حیدر آباد کے لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ آئینی طور پر پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی اقتدار کی زبان ہنوز انگریزی ہے۔ میں نے عرض کی کہ اس رُکاوٹ کے باوجود نہ صرف اُردو بلکہ علاقائی زبانوں کا ادب بھی روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ افسروں کی بارگاہ تک، ہر چند کہ انگریزی اخباروں اور رسالوں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہے لیکن اُردو اخباروں کی اشاعت انگریزی اخباروں سے کہیں زیادہ ہے اور طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی اُن کا معیار بہت بلند ہے۔ میں نے مجلس ترقی ادب لاہور، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ترقی اُردو بورڈ اور اس نوع کے دوسرے اداروں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے سید امتیاز علی تاجؔ مرحوم کی خدمات کو سراہا جو مجلس ترقی ادب کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اُردو کے کم و بیش سارے کلاسیکی ادب کو ٹائپ میں یکساں سائز پر شائع کیا تھا اور قیمت بھی بہت معقول تھی، مثلاً سر سیّد کی تحریریں جو بالکل نایاب تھیں، سترہ اٹھارہ جلدوں

میں شائع ہوئی ہیں اور اُن کی مجموعی قیمت فقط ساٹھ روپے ہے۔ اِسی ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات جن میں جان گلکرائسٹ کی تصنیفات بھی شامل ہیں شائع کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اُردو ترجمے کی بھی سترہ اٹھارہ نہایت ضخیم جلدیں ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی ہی سے ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' کے نام سے ایک کتاب پندرہ جلدوں میں چھپی ہے۔ اِس میں عربی، فارسی، اُردو، بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ بلتی (بلتستان کی زبان) شنا (گلگت کی زبان) بروشسکی (ہنزہ کی زبان) کھووار (چترال کی زبان) کشمیری، ہندکو، سرائیکی (ملتانی) اور براہوی (بلوچستان) زبان و ادب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان قوموں کی تاریخ و تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کراچی تقریباً بیس برس سے اُردو کا ایک نہایت جامع لغت مرتب کرنے میں مصروف ہے مگر مجھ کو ماننا پڑا کہ ہر چند کہ پاکستان میں علمی و ادبی کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں لیکن ابھی وہ حالات نہیں پیدا ہوئے ہیں کہ ادیب اور دانش ور فقط اپنی تصنیفات کے سہارے زندہ رہ سکیں اور فکرِ معاش سے آزاد ہوں۔ ان کو ٹی وی، ریڈیو، اخبار، سرکاری دفتر یا اس قسم کے دوسرے اداروں میں ملازمت کرنا پڑتی ہے۔

اُردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اُردو کا کوئی بہی خواہ سندھی، پنجابی، پشتو یا بلوچی کو دفن کر کے اپنی زبان کا سکہ نہیں چلانا چاہتا کیونکہ اولاً یہ ممکن نہیں ہے۔ دوئم اُردو، ہمیشہ صلح و آشتی اور بھائی چارے کی زبان رہی ہے۔ آج اگر یہ زبان راس کماری سے درّۂ خیبر تک کسی نہ کسی انداز میں بولی یا سمجھی جاتی ہے تو اس میں جبر اور دھونس کو دخل نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُردو میں رابطے کی زبان بننے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔ میں نے کہا کہ اُردو کا کسی زبان سے جھگڑا نہیں ہے اور نہ وہ کسی زبان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتی ہے بلکہ ہمارا خیال

ہے کہ پاکستان میں اگر علاقائی زبانوں کو فروغ ہوگا تو اس سے اُردو کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ آج بھی جس طرح آپ کے دیس میں اُردو کا دامن تلگو ادب کے نئے پرانے شاہکاروں کے ترجمے سے بھر رہا ہے اسی طرح پاکستان میں بھی علاقائی زبانوں کے ترجمے سے اُردو کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہو رہا ہے۔ علاقائی زبانوں کا قریب قریب سارا لوک اور کلاسیکی ادب اُردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ مثلاً شیخ ایاز نے جو سندھی کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اُردو میں بھی فکرِ سخن کرتے ہیں سندھ کے ہردل عزیز قومی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے۔ علاقائی زبانوں کے میل جول سے بے شمار نئے الفاظ اور محاورے اُردو میں رائج ہو رہے ہیں اور علاقائی زبانوں کے نئے ادیبوں کی تحریریں اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔

حیدر آباد آصف جاہی دور میں اُردو زبان و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ریاست کی سرکاری زبان اُردو تھی۔ عدالتوں کے فیصلے اور دفتری دستاویزات سب اُردو میں لکھے جاتے تھے۔ ذریعۂ تعلیم بھی ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ جماعتوں تک اُردو ہی تھا۔ یہ صورتِ حال انضمام کے بعد وزیرِ اعلیٰ۔ رام کشن راؤ (میرے میزبان نرسنگ راؤ کے تایا) کے زمانے تک باقی رہی البتہ ۵۶ء میں جب ہندوستانی صوبوں کی لسانی بنیادوں پر از سرِ نو تشکیل ہوئی اور آندھرا پردیش وجود میں آیا تو اس نئی ریاست کی سرکاری زبان تلگو قرار پائی۔ مگر آندھرا پردیش ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں اُردو کو تلگو کے پہلو بہ پہلو علاقائی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اور زبان و ادب کی ترقی کے لیے جو کوششیں ہر سطح پر وہاں ہو رہی ہیں وہ قابلِ تعریف بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔

سر تیج بہادر سپرو نے ایک بار کہا تھا کہ اُردو زبان ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی ہے (یہ فقرہ انجمن ترقی اُردو کے سرکاری ترجمان "ہماری زبان" کے سرورق پر برسوں لکھا رہا)۔ سر تیج کے اس فقرے کی سچائی کا شاہد حیدر آباد ہے جہاں وہ غیر مسلم ادیب اور

دانش ور بھی، جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے اُردو کی ترویج واشاعت میں پیش پیش ہیں۔ اِن میں سرِ فہرست جناب یم باگاریڈی صدر اُردو اکیڈمی اور وزیر پنچایت راج ہیں۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں اور انگریزی، اُردو، ہندی، تلگو، کنڑی اور مرہٹی کے علاوہ فارسی پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں (وہ جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل ہیں)۔ جہاں تک اُردو سے محبت کا تعلق ہے مسٹر باگاریڈی اُردو اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسٹر سری واستو کے بقول ''بلاشبہ اپنے قول و فعل میں فرزندِ اُردو ہیں''۔ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلوانے میں مسٹر نیلم سنجیواریڈی صدر جمہوریۂ ہندوستان (جن کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے) کے علاوہ مسٹر باگاریڈی کی انتھک کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ اُردو میں کئی کتابوں کے مصنّف بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''آندھرا پردیش'' میں جو ''مادرِ جامعہ'' کے نام معنون ہے اور اقبالؔ کے شعر۔

هر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

سے شروع ہوتی ہے، سچ لکھتے ہیں کہ ''اس علاقے میں لسانی عصبیت کا دُور دور تک وجود نہیں ہے بلکہ تلگو اور اُردو ایک دوسرے کو بڑھاوا دیتی ہیں اور ایک دوسرے کی اشاعت و ترقی کی آرزو کرتی ہیں۔ زبانوں کے اس مخلصانہ رنگ و امتزاج نے یہاں کے پورے ماحول کو محبت، رفاقت اور علم و ادب و فنون کا ایک دلکش گہوارہ بنا دیا ہے خصوصاً تلگو اور اُردو اس ریاست میں شانہ بشانہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ اگرچہ اُردو کا جنم شمالی ہند میں ہوا لیکن یہ افتخار آندھرا پردیش کو حاصل ہے کہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ اِسی سرزمین کا شاعر اور فرماں روا تھا۔''

حیدر آباد میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ میرے عزیز ڈاکٹر مجاور حسین نے جو حیدر آباد یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد ہیں مجھ

کو بتایا کہ ہندوستان کی ٦٦ یونیورسٹیوں میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہے اور اُردو کے ٦٠٠ (چھ سو) اساتذہ یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حیدر آباد میں اُردو اکیڈمی، انجمن ترقی اُردو، ابوالکلام انسٹیٹیوٹ، انجمن ترقی پسند مصنفین اور ادارۂ ادبیات اور دوسرے متعدد ادارے اُردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں اور اُن کو مالی امداد بھی ملتی ہے۔ ابوالکلام انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہمارے پرانے کرم فرما جناب فضل الرحمٰن ہیں۔ ایک تقریب میں ملاقات ہوئی، بڑی شفقت سے ملے، کہنے لگے میرے گھر آنا۔ یہ وہی مکان ہے جس میں قاضی عبدالغفار رہتے تھے۔ اپنی ایک تازہ تصنیف بھی مجھے عنایت کی مگر میں وعدہ کرنے کے باوجود اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ اِن دنوں اُردو کی جو انسائیکلوپیڈیا مرتب کر رہے ہیں اُس کی تفصیلات ان کے مددگار مسٹر کلیم اللہ سے معلوم ہوئیں۔ کلیم اللہ بمبئی میں ہمارے ہمسفر اور ہم صفیر تھے اور اب ابوالکلام انسٹیٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اُردو بورڈ کی سالانہ گرانٹ ایک کروڑ روپیہ ہے۔ اس کا بنیادی کام اُردو نصاب کی کتابیں تیار کرنا اور تحقیقی منصوبوں کی مالی امداد کرنا ہے۔ ترقی اُردو بورڈ نے انسائیکلوپیدیا مرتب کرنے کا کام ابوالکلام انسٹیٹوٹ کے سُپرد کر دیا ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا بارہ جلدوں میں ہوگی اور اب تک اس کی چار جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ اُردو کا ایک جامع لغت بھی زیرِ ترتیب ہے۔

حیدر آباد میں میری آنکھیں روزنامہ پیام، صبحِ دکن، مشیرِ دکن اور رعیت کو تلاش کرتی رہیں کہ ہمارے زمانے میں دکن کے ممتاز اخبار وہی تھے لیکن ان میں سے اب کوئی باقی نہیں۔ اُن کی جگہ اب سیاست، رہنمائے دکن اور منصف شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی اور تلگو کے اخبارات بھی ہیں۔ اُردو اخباروں کی مجموعی اشاعت اگرچہ ایک لاکھ سے زیادہ نہیں (جو تلگو اخباروں کے مقابلے میں بہت کم ہے) لیکن حیدر آباد کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں اُردو اخباروں کو جو اہم مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اُن کی

تعدادِ اشاعت سے نہیں لگانا چاہیے۔ اُردو اخبارات پاکستانی اخبارات کی مانند آفسٹ میں چھپتے ہیں لیکن ان کی کتابت اور طباعت کا معیار اطمینان بخش نہیں ہے۔

منشی پریم چند کے صد سالہ یومِ پیدائش کی تقریبات اُن دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں منعقد ہو رہی تھیں۔ حیدر آباد کا پریم چند سیمینار اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ یہ سیمینار اُردو اکیڈمی کی جانب سے اُردو ہال میں بڑے اہتمام سے منایا گیا اور مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ حاضرین کی تعداد دہلی کے چار روزہ سیمینار کے اجلاس سے (جس میں شریک ہوا تھا) زیادہ تھی۔ اس سیمینار کا حاصل ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تقریر تھی۔ اس طوطی شیریں بیان کی خوش مذاقی اور خوش گفتاری کا تھوڑا سا تجربہ مجھ کو پہلے ہی دن دوپہر کے کھانے پر ہو گیا تھا۔ وہ میزبان تھیں لہٰذا ہر شخص موقع پا کر ان پر فقرے چُست کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اکیلی چومکھی لڑ رہی تھیں۔ ان کے ناوکِ نطق و لب سے کسی کو مفر نہ تھا اور میں انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ برق میری طرف کب رُخ کرتی ہے لیکن شاید مجھ کو مہمان سمجھ کر بخش دیا گیا۔

پریم چند سیمینار میں زینت ساجدہ کی تقریر کا موضوع "منشی پریم چند کے نسوانی کردار" تھا۔ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں عورت، ماں، بیوی، بیٹی بھی ہے اور طوائف بھی۔ پرانی وضع کی گھر گرہستن بھی ہے اور نئی طرز کی سوسائٹی لیڈی بھی۔ مگر زینت ساجدہ کے بقول عورت کی شخصیت کا احترام اور اس سے بے پناہ ہمدردی کا جو جذبہ پریم چند کی تحریروں میں ملتا ہے وہ شاید ہی کسی ادیب کو نصیب ہو بلکہ بیشتر ادیبوں کے افسانوں میں تو عورت فقط بستر کی زینت اور ہوس کی بے شرمیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ: "پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں مرد کی لگام ہر جگہ کسی نہ کسی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

اب راستہ صاف تھا اور زینت ساجدہ ادب کی لگام ہاتھ میں لیے بے تکان دوڑنے

پر آمادہ تھیں مگر ڈاکٹر حسینی شاہد نے جو سیمینار کمیٹی کے سیکریٹری تھے اپنا حقِ شوہری استعمال کر کے اس چہکتے بلبل کا منھ بند کر دیا اور سیمینار پر اوس پڑ گئی۔

بقر عید کی شام ہم نے پروفیسر انور معظم اور جیلانی بانو کے ساتھ گزاری۔ جیلانی بانو سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب ان کی کہانیاں ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں چھپتی تھیں۔ ان کے اور واجدہ تبسم کے افسانوں کے ذریعہ میں حیدر آباد کی نئی نسل کی ادبی سرگرمیوں سے تھوڑا بہت روشناس ہوا تھا۔ اِسی دوران میں پتہ چلا کہ وہ علامہ حیرت بدایونی کی صاحبزادی ہیں۔ علامہ حیرت مرحوم "پیام" کے منیجر قاری عباس حسین کے دوست تھے اور میں کبھی کبھار قاری صاحب کے ہمراہ علامہ حیرتؔ کے گھر جایا کرتا تھا۔ جیلانی بانو سے ملاقات اس وقت ہوئی جب کئی برس گزرے، وہ اور انور معظم صاحب کراچی اور میرے مکان کے قریب ہی اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرے۔ وہ پچھلے سال بھی کراچی آئے تھے مگر فقط ایک بار ملنا ہوا تھا۔ انور معظم صاحب اسلامیات کے پروفیسر ہیں لہٰذا میں اُن سے دورِ حاضر کے اسلامی افکار و احوال پر گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ہنس مکھ ہونے کے باوصف معظم صاحب بے حد کم سخن واقع ہوئے ہیں اس لیے زیادہ وقت ادبی مسائل ہی پر گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت جیلانی بانو نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ "پرایا گھر" عنایت کیا۔ ہماری خاتون افسانہ نگار نہ جانے اتنے حقیقتوں سے لبریز افسانے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ پڑھو تو یوں لگتا ہے گویا ساری دنیا دیکھ چکی ہیں اور ہر قسم کے حسّی تجربات سے آگاہ ہیں مگر انسانی رشتوں کے پیچ و خم اور غمِ ہستی کے اظہار کا ہُنر ان کو کون سکھاتا ہے؟

ایک شام حیدر آباد کے ایک نوجوان اور صاحبِ ذوق شاعر راشد آذرؔ کے ساتھ گزری۔ وہ میرے جواں مرگ دوست مصطفٰے زیدی کے مدّاح نکلے۔ اپنے آخری مجموعے "کوہِ ندا" کا مسودہ مصطفٰے زیدی نے خودکشی سے فقط تین دن پہلے مجھ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ اس کی ایک نظم کا ہدف فیضؔ صاحب اور میں ہوں۔ راشد صاحب کے استفسار پر

میں نے بتایا کہ جن دنوں ہم لوگ کراچی سے "لیل و نہار" شائع کرتے تھے تو مصطفیٰ زیدی ایک نظم اشاعت کے لیے لائے جس کے آخری شعر میں صدرِ پاکستان کو ملک کا جیلر کہا گیا تھا۔ وہ زمانہ جنرل یحییٰ خاں صدرِ پاکستان کے مارشل لاء کا تھا۔ ہم نے مصطفیٰ زیدی سے کہا کہ یہ شعر نکال دو ورنہ پرچہ بند ہو جائے گا۔ تم ایسے کون سے قومی رہنما ہو جس کے ایک شعر پر ہم اخبار کو قربان کر دیں (وہ جنرل یحییٰ خاں سے اس لیے ناراض تھے کہ سرکاری افسری سے اُن کو برطرفی جنرل یحییٰ خاں کے حکم سے ہوئی تھی)۔ زیدی نہ مانے اور نظم واپس لے کر چلے گئے مگر دوسرے ہی دن پھر آئے اور ہماری "جرأتِ کردار" کے خلاف ایک طویل طنزیہ نظم ہمارے سامنے رکھ دی اور کہنے لگے کہ ہمت ہو تو اس کو چھاپ دو۔ ہم نے چھاپ دی۔ جیلر والی نظم اور یہ طنزیہ نظم دونوں "کوہِ ندا" میں موجود ہیں۔

راشد میاں، تجریدی شاعری کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تین مجموعے مجھ کو دیے اور میں نے ایک رات میں پڑھ لیے۔ ان پر جو جانکاہ سانحہ گزرا اُس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے ہیں۔ اس صدمے کا اثر ان کے کلام پر بہت گہرا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری محبوب کی دائمی مفارقت کا نوحہ بن گئی ہے۔ ان کے جذبے کے خلوص اور احساسات کی سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن پرانے زخموں کو خونِ دل پلا کر تازہ کرتے رہنا صحت مند ذہن کو زیب نہیں دیتا۔ غمِ ذات خواہ کتنا ہی پیارا ہو زندگی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ غمِ ذات کو غمِ کائنات میں حل کر دینا آسان کام نہیں اور نہ ہر شخص کا مزاج اس کو قبول کرتا ہے البتہ اس کوشش میں غمِ ذات کی شدت اگر کم ہو جائے تو بھی غنیمت ہے مگر راشد میاں کو مشورہ دینے والا میں کون! ان کو چارہ سازوں اور غمگساروں کی حاجت ہے۔ ناصحوں کی نہیں۔

ایک شام انوار العلوم کالج کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں سے گفتگو کا موقع ملا۔

اجتماع چونکہ محققین کا تھا لہٰذا میں نے البیرونی کی کتاب "الہند"، ابن ندیم کی "الفہرست" اور شہرستانی کی "الملل والنحل" کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ ان بزرگوں کا تلاشِ حق کا جذبہ اور حصولِ علم کی خواہش ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ان کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ مختلف مذہبوں اور معاشروں کے مطالعے سے ان کا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا لیکن ہمارے دانشوروں نے مدت ہوئی یہ روایت ترک کر دی ہے نتیجہ یہ ہے کہ آج اُردو زبان میں کسی قدیم مذہب یا معاشرے کے بارے میں کوئی ایک مستند اور معتبر کتاب موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی اُردو داں یہ جاننا چاہے کہ ہندو مذہب، ہندو فلسفہ یا بدھ مذہب یا یہودی مذہب یا عیسائیت کے بنیادی اُصول کیا ہیں تو اس کو ناکامی ہوگی۔ میں نے مغربی محققین کی علمی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مانٹگومری واٹ (MONTGOMERY WATT) اور پروفیسر حتی وغیرہ کی کتابیں اسلامیات کے نصاب میں داخل ہیں لیکن کیا کسی مسلمان محقق کو گوتم بدھ، حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ پر کوئی کتاب لکھنے کی توفیق ہوئی۔ اس کوتاہی کے اسباب و علل پر افسوس ہے کہ زیادہ بحث نہ ہو سکی کیونکہ کالج کی شام کی شفٹ کا وقت ہو گیا تھا۔ بہر حال کالج کے پرنسپل صاحب اور اساتذہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری گزارشات ہمدردی سے سُنیں۔ باہر نکلا تو کالج کے کشادہ صحن میں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں کلاس کے انتظار میں کھڑے نظر آئے۔ ان میں دو تین ٹولیاں ایرانیوں کی بھی تھیں جو اپنے چہرے بشرے اور سج دھج سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ نرسنگھ سے حال دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ حیدر آباد کے کالجوں میں تقریباً ایک ہزار ایرانی طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں البتہ وہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ امام خمینی کا حامی ہے اور دوسرے گروہ کا تعلق مجاہدینِ خلق اور فدائین خلق (اکثریتی) سے ہے۔ ان میں ہر وقت ٹھنا ٹھنی رہتی ہے بلکہ کئی بار تومار پیٹ کی نوبت بھی آچکی ہے۔

ایک دن نرسنگھ راؤ مجھ کو تلگو فلم "ما بھومی" (ہماری زمین) دکھانے لے گئے۔ میں نے اس وقت تک کوئی تلگو فلم نہیں دیکھی تھی البتہ جاں نثار اختر مرحوم کے بیٹے جاوید نے کراچی میں بتایا تھا کہ تلگو میں فلمی صنعت نے بہت ترقی کی ہے اور ہندوستان میں بے شمار تلگو فلمیں بن رہی ہیں۔ ما بھومی حیدر آباد میں بنی ہے اور اتنی مقبول ہے کہ اس کے دو سو سے زیادہ شو ہو چکے ہیں لیکن ٹکٹ گھر کے سامنے شائقین کی قطار بدستور لگی رہتی ہے۔ بیرونِ ملک کے لیے مکالمے / ٹائٹل نرسنگ راؤ نے لکھے ہیں۔

"ما بھومی" یادش بخیر تلنگانہ کے بارے میں ہے۔ وہی تحریک جس کو مخدوم نے "مرا ثبات، میری کائنات، میری حیات" کہا تھا۔ (اس فلم میں ٹریڈ یونین لیڈر کا کردار مخدوم ہی کا چربہ ہے) فلم میں آصفی دور کے کسانوں پر مقامی زمین داروں کے مظالم، سرکاری عملے اور زمین داروں کی ملی بھگت اور آخر کار اس جور و ستم کے خلاف کسانوں کی مسلح جدوجہد کو بڑی دلیرانہ فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کسان زمینداروں کو مار بھگاتے ہیں اور زمین آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اسی اثنا میں ہندوستانی فوج ریاست میں داخل ہوتی ہے۔ کسان خوش ہیں کہ اب ان کو زمین داروں کی لوٹ کھسوٹ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا لیکن ریاست کے الحاق کے بعد وہی زمیندار جو کل تک حضور نظام کی وفاداری کا دم بھرتے تھے، کھدر کا کرتا اور گاندھی ٹوپی پہن کر دیش بھگتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ سرکاری جیپوں میں بیٹھ کر اپنے علاقے کا رُخ کرتے ہیں اور پولیس اور فوج کی مدد سے کسانوں کو شکست دے کر زمینوں پر دوبارہ قابض ہو جاتے ہیں۔ اس فلم میں فنی خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن طبقاتی جدوجہد کے سچے واقعات پر مبنی اتنی تیز و تند اور مفاہمتوں سے پاک فلم شاید ہندوستان میں بھی اب تک نہیں بنی ہے۔

ایک روز مخدوم کے بیوی بچوں سے ملنے گیا۔ میں نے ان کی بڑی بیٹی اساوری کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی تھی۔ بیگم مخدوم اور دوسرے بچوں سے

ملاقات کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ سب لوگ اب آرام سے ہیں۔ مخدوم کو تو دوسروں کی چارہ گری سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ اپنے جیب و گریباں کی فکر کرتا البتہ مخدوم کے شیدائیوں کی کوشش سے دو مکان مخدوم کی بیوی اور اساوری کو الاٹ کر دیے گئے ہیں اور ان کے دونوں بیٹے نصرت اور ظفر ملازم ہیں۔ میرے پاس پرُسے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ سارا وقت مخدوم کی پوتیوں، نواسیوں کے ساتھ بیٹھا جشن مخدوم کی تصویروں کا البم دیکھتا رہا۔ وہاں سے اُٹھ کر سیدھے درگاہ شاہ خاموش گیا۔ جہاں راج بہادر گوڑ پھولوں کی چادریں لیے منتظر تھے۔ ایک چادر شاہد صدیقی کی قبر پر چڑھائی اور دوسری مخدوم کی قبر پر جو "سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے"۔ ہم لوگ چلنے لگے تو قبروں کے نگران نے شکایت کی کہ مخدوم صاحب کی قبر کے گرد لوہے کی جو سلاخیں نصب ہیں بچے ان پر جھولا جھولتے ہیں جس کی وجہ سے ایک سلاخ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ مخدوم کو بچوں سے کتنا پیار تھا اور بچوں کی ان شرارتوں کو اگر وہ دیکھ سکتا تو کتنا خوش ہوتا۔

ایک روز حسن ناصر مرحوم کی والدہ محترمہ بیگم زہرہ علمبردار حسین کی خدمت میں حاضری دی۔ اُن کی جرأت اور صبر و ضبط کا منظر لاہور میں دیکھ چکا تھا جب وہ نومبر ۶۰ء میں حسن ناصر کی لاش لینے تشریف لائی تھیں اور ناکام واپس گئی تھیں۔ اب وہ اپنے بنجارہ ہل کے بنگلے کے بجائے شہر میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہیں۔ بڑی شفقت سے ملیں۔ دیر تک ناصر کے پاکستانی دوستوں کی خیریت پوچھتی رہیں۔ ملک نورانی اور ممتاز کیسے ہیں۔ میجر اسحاق ان دنوں کیا کر رہے ہیں البتہ حسن ناصر کا انہوں نے ایک بار بھی نام نہیں لیا اور نہ میں نے اُن کے زخم کو تازہ کرنا مناسب سمجھا۔ مجھ سے تو تکلفاً بھی یہ نہ کہا گیا کہ آپ پاکستان کب تشریف لائیں گی اور پوچھتا کس منہ سے جب کہ اُن کے شہید جگر فرزند کی قبر کا نشان تک موجود نہیں۔ بیگم صاحبہ سے دوسری بار راج بہادر

گوڑ کے گھر پر دعوت میں ملاقات ہوئی۔ وہ خرابیِ صحت کے باعث کہیں آتی جاتی نہیں لیکن بیٹے کی یاد اُن کو کھینچ لائی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ جس سے محبت کرو اُس کے ہر دوست آشنا سے مل کر تھوڑی تسکین ہوتی ہے۔

حسن ناصر سے ہماری رفاقت کی عمر چار سال سے بھی کم ہوگی اور لطف یہ ہے کہ اُن سے آزادی سے ملنے کا موقع قید خانے میں نصیب ہوا ورنہ جیل سے باہر اُن سے جب بھی ملاقات ہوئی تو وہ بھی رُوپوش تھے اور ہم بھی رُوپوش۔ میں نے اُن کو پہلی بار مئی یا جون ۱۹۴۸ء میں بمبئی میں دیکھا تھا۔ میرے رابطے کے رفیق ایک دن مجھ سے کہہ گئے تھے کہ کل رات کے وقت فلاں حلیے کا ایک لڑکا آئے گا اور تم کو ڈاکٹر ادھیکاری کے پاس لے جائے گا۔ ڈاکٹر ادھیکاری نے جرمنی سے سائنس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی مگر وطن واپس آکر کمیونسٹ تحریک میں شامل ہوگئے تھے اور مرتے دم تک اُس سے وابستہ رہے۔ وہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور پولٹ بیورو کے رکن تھے اور پارٹی کے نظریاتی امور کے سربراہ۔ اُن دنوں تلنگانہ تحریک چل رہی تھی اور وہ بھی رُوپوش تھے۔ رات کے نو بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو ایک لڑکا کھڑا تھا، پتلون اور بُش شرٹ پہنے۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اونچا قد، گورا چٹا رنگ، بڑی بڑی ہنستی ہوئی آنکھیں اور پیشانی پر ہلکے ہلکے بل۔ یہ حسن ناصر تھے مگر نہ انہوں نے اپنا نام بتایا نہ میں نے روپوشی کے آداب کے خیال سے پوچھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں رُک رُک کر بولتے تھے۔ انگریزی کے فقرے خالص انگریزوں کے انداز میں، جس سے خیال ہوا کہ اس لڑکے نے ضرور کسی کانونٹ اسکول میں تعلیم پائی ہوگی البتہ اُن کی اُردو پر دکنی زبان کی چھاپ تھی۔ میں نے پوچھا کیا آپ حیدر آباد کے رہنے والے ہیں؟ اُنہوں نے کہا جی ہاں۔ تب اجنبیت کی دُھند چھٹ گئی اور ہم نے اُن سے تلنگانہ تحریک اور حیدر آبادی دوستوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ مخدوم کا تذکرہ لازمی

بات تھی۔ حسن ناصر کہنے لگے کہ انقلابی ادب کا شوق مجھ کو مخدوم کی تقریریں اور نظمیں سن کر پیدا ہوا۔

حسن ناصرؔ مجھ کو ڈاکٹر ادھیکاری سے ملوا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد جب میں رُخصت ہونے لگا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون تھا۔ وہ بولے اس کا نام حسن ناصر ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن اور بدر الحسن کا (حیدر آباد بک ڈپو والے) بھانجا ہے۔ تمہارے امریکہ جانے کے بعد حال ہی میں پارٹی میں شامل ہوا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد مجھ کو کسی کام کے سلسلے میں لاہور سے کراچی آنا پڑا۔ یہاں میں ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ حسن ناصر صاحب سڑپڑ کرتے چلے آرہے ہیں (وہ عموماً پشاوری چپل پہنتے تھے اور پاؤں گھسیٹ کر چلتے تھے)۔ حسن ناصر سے یوں اچانک مل کر خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔ وہ ہنستے ہوئے گلے ملے تو میں نے کہا یار آپ نے بمبئی میں نہیں بتایا کہ آپ بھی پاکستان جا رہے ہیں۔ وہ میرے اس احمقانہ سوال پر مُسکرا کر چپ ہو گیا۔ سوچتا ہو گا کتنا بے وقوف آدمی ہے جس کو یہ خبر نہیں کہ رُوپوش سیاسی کارکن اپنا پروگرام ہر کس و ناکس کو نہیں بتاتے۔ انہوں نے میرے کراچی آنے کا سبب پوچھا، تب پتہ چلا کہ وہ بھی کُل وقتی کارکن کی حیثیت سے پارٹی کا کام کر رہے ہیں۔

ایک دن وہ مجھ کو کراچی کے خاص خاص ساتھیوں سے ملوانے اپنے گھر لے گئے۔ گھر کیا تھا مزدوروں کے احاطے میں ایک کھنڈر تھا۔ جس کے دو کمرے ابھی تک سلامت تھے۔ ان میں بان کی تین چار پائیاں بچھی تھیں۔ ایک ٹوٹی سی میز تھی جس کے پائے اینٹوں کے سہارے کھڑے تھے۔ دو مونڈھے تھے اور ایک لالٹین۔ نہ پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ تین چار کھونٹیاں تھیں جن پر صاف اور میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو حسن ناصر کا ایک ساتھی بازار گیا اور ناشتہ دان میں دال اور روٹیاں لے آیا۔ چائے

حسن ناصر نے خود بنائی۔ میں دل ہی دل میں ان نوجوان انقلابیوں کے جذبۂ قربانی کی داد دیتا رہا۔ احساسِ کمتری کے باعث میں ان سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اپنی تندرستی کا خیال رکھا کرو۔

چند ماہ بعد بنے بھائی (سجاد ظہیر) نے جو پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے بتایا کہ حسن ناصر کو مرکزی کمیٹی کا رکن بنالیا گیا ہے (وہ مرکزی کمیٹی کا سب سے کم سن رکن تھا مگر پاکستان کے سب سے بڑے شہر کی تنظیمی ذمہ داریاں اس کے سپرد کی گئی تھیں)۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے مہینے ملاقات ہوتی لیکن ناصر اتنے کم سخن تھے اور سیاسی فکروں میں اتنے غرق رہتے تھے کہ ان کے ساتھ کھل کر باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ یوں بھی بڑوں کا ادب کرنا ان کی خاندانی روایتوں میں شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے ہماری دوستانہ بے تکلفی کبھی نہ ہو سکی۔

البتہ ۱۹۵۲ء میں جب حسن ناصر قلعۂ لاہور سے سینٹرل جیل میں (جو اب شادمان کالونی بن گیا ہے) منتقل ہو کر آئے تو دو ڈھائی مہینے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ بے سروسامانی کی زندگی، غذا کی خرابی اور اسیری کی صعوبتوں کے باعث ان کا معدہ بالکل خراب ہو چکا تھا لیکن ان کو اپنی تندرستی کی بالکل پروا نہ تھی۔ ساتھیوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ بڑی غیر انقلابی حرکت ہے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہم لوگوں نے کھانے میں لال مرچ کا استعمال بالکل بند کر دیا لیکن حسن ناصر کبھی کبھی چھپ کر لال مرچ کھالیا کرتے تھے۔ آخر ان کی عمر ہی کیا تھی۔ احاطے میں آم اور جامن کے بے شمار درخت تھے۔ صبح سے دوپہر تک تو حسن ناصر کمرے میں بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے البتہ دوپہر میں جب ہم لوگ کھانا کھا کر سو جاتے تو حسن ناصر کے اندر چھپا ہوا کھلنڈرا لڑکا جاگ اٹھتا۔ وہ درختوں پر چڑھ جاتے اور کیریاں توڑ توڑ کر کھاتے۔ لال مرچ اور نمک کی پڑیا ان کی جیب میں ہوتی۔

ان بد پرہیزیوں کے باوجود حسن ناصر کی صحت رفتہ رفتہ اچھی ہونے لگی تھی کہ ایک دن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آئے اور کہنے لگے کہ حسن ناصر صاحب اپنا سامان باندھیے آپ واپس کراچی بھیجے جائیں گے۔ حسن ناصر کا چہرہ اُتر گیا اور ہم لوگوں کو بڑا افسوس ہوا۔ بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ یہاں تو ہم پانچ چھ لوگ ہیں جو حسن ناصر کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن کراچی جیل میں وہ بالکل اکیلا ہوگا۔ لاہور میں رفیقوں کے رشتہ دار کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیں دے جاتے تھے مگر کراچی میں حسن ناصر کا کوئی عزیز رشتہ دار ایسا بھی نہیں جو اُن سے مل جائے۔ سامان بھیجنا تو در کنار ہم لوگوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو تمام حالات بتائے اور کہا کہ آپ چاہیں تو حسن ناصر کا تبادلہ روک سکتے ہیں لیکن اس شقی نے ہماری بات نہ مانی اور مانتا کیوں۔ سیاسی قیدیوں کی جاسوسی کر کے اور انہیں ستا کر تو اس نے انگریزوں سے خان صاحب کا خطاب پایا تھا اور اب اسی قسم کی خدمات کے صلے میں وہ انسپکٹر جنرل جیل بننے والا تھا۔ آخر حسن ناصر کی روانگی کا وقت آگیا اور ہم لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے اسے رُخصت کیا۔ وہ ہاتھوں کے اشارے سے خدا حافظ کہتا رہا پھر جیل کے پھاٹک نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا۔ میں حسن ناصر کو پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔

حسن ناصر سے ہماری خط و کتابت نہ تھی لیکن گاہے ماہے اُن کی خیر خبر معلوم ہوتی رہتی تھی۔ ہم لوگ جیل ہی میں تھے کہ اطلاع ملی کہ وہ رہا ہو گئے ہیں اور اپنے والد کو دیکھنے، جو بہت بیمار تھے حیدر آباد چلے گئے ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ وہ واپس آگئے ہیں اور نیشنل عوامی پارٹی کے آفس سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ جماعت مولانا بھاشانی، میاں افتخار الدین، خان عبدالغفار خاں، مسٹر جی ایم سیّد، میاں محمود علی قصوری، محمود الحق عثمانی، میر غوث بخش بزنجو اور دوسرے جمہوریت پسند سیاست دانوں نے ۱۹۵۷ء میں مل کر بنائی تھی۔ محمود الحق عثمانی اُس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اُنہیں دِنوں میں کراچی آیا تو

حسن ناصر سے ملنے اُن کے دفتر گیا مگر وہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے، اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں نے جب حکومت کا تختہ اُلٹا اور ملک میں مارشل لا لگا تو ہم سب جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں بائیں بازو سے تھا گرفتار کر لیے گئے مگر حسن ناصر نے رُوپوشی کو گرفتاری پر ترجیح دی اور بدستور پارٹی کا کام کرتے رہے لیکن دو سال بعد کسی مُخبر کی اطلاع پر پکڑے گئے اور لاہور قلعے بھیج دیے گئے۔ لاہور قلعہ کے شاہی محلات اور عجائب گھر کی سیر کرنے والوں کو کیا خبر کہ اس تاریخی عمارت کے ایک گمنام گوشے میں جس کے ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے پھاٹک پر نہ کوئی تختی لگی ہے نہ کوئی چوکیدار، پہرے دار دکھائی دیتا ہے سیاسی قیدیوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچانے کے کیسے کیسے سامان موجود ہیں۔ ظلم و تشدد کے اس سیہ خانے میں قیدیوں کی چیخ پکار، کال کوٹھڑیوں کی بھیانک دیواروں ہی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ باہر والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

نومبر ۱۹۶۰ء کی کوئی تاریخ تھی جب کسی نے میجر اسحاق محمد کو چپکے سے آ کر بتایا کہ حسن ناصر کو قلعہ والوں نے اتنا مارا اتنا مارا کہ اُن کا دم نکل گیا۔ یہ خبر جس نے سُنی سناٹے میں آ گیا۔ قلعہ کے ظلم و تشدد کا تجربہ تو ہم میں سے بہتوں کو تھا مگر اب تک قلعہ میں کسی سیاسی قیدی کی ہلاکت نہیں ہوئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس ہولناک خبر کی تصدیق کیسے ہو۔ مارشل لاء کی دہشت ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور ہر شخص اپنی بے بسی کا قیدی بنا حسن ناصر کی موت پر خاموشی سے افسوس کُناں تھا۔ بس ایک میجر اسحاق تھے جو بے خوف و خطر دشمنوں کو بے نقاب کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بہت دوڑ دھوپ کی، متعلقہ سرکاری حکام سے ملے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، تب انہوں نے ہائی کورٹ کا رُخ کیا۔ وہ راولپنڈی سازش کیس سے رہا ہونے کے بعد وکالت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے لاہور

ہائی کورٹ میں حسن ناصر کی حبس بیجا کی درخواست دائر کر دی اور کہا کہ ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حسن ناصر کو قلعہ میں ہلاک کر دیا گیا ہے مگر اُن کی موت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے لہٰذا ہماری گزارش ہے کہ حکام متعلقہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ حسن ناصر کو عدالت میں پیش کریں تاکہ اس حادثے کی تصدیق یا تردید ہو سکے۔ آخر کئی دن کی بحث بحثی کے بعد ججوں نے حکم دیا کہ حسن ناصر کو عدالت میں پیش کیا جائے، تب وکیلِ سرکار کو چار و ناچار اعتراف کرنا پڑا کہ حسن ناصر زندہ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے خودکشی کی ہے۔ یہ عذرِ گناہ نہایت لغو تھا کیونکہ قلعے کے ہر سیل کے سامنے ۲۴ گھنٹے مسلح سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے اور دروازے لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے بنے ہیں لہٰذا قیدیوں کی کوئی نقل و حرکت پہرے داروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ رات کے وقت سیل کے اندر بڑا سا بلب جلتا ہے جس کا سوئچ سیل کے باہر ہوتا ہے تاکہ قیدی روشنی کو بجھا نہ سکیں۔ ایسی صورت میں خودکشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عدالت نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا اور یہ حکم صادر فرمایا کہ حسن ناصر کی لاش اس کی والدہ کے حوالے کر دی جائے (اُن کو میجر صاحب نے تار دے کر حیدر آباد سے بلوا لیا تھا)۔ مگر اربابِ اختیار نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ لاش کا پتہ بتا دیتے تو زخم کے نشان قتل کی شہادت دینے کو کافی ہوتے۔ چنانچہ جو قبر کھودی گئی وہ حسن ناصر کی نہ تھی بلکہ اُن کی والدہ کے بقول:

"ایک چھوٹے قد کے آدمی کی تھی۔ میں نے لاش کے پاؤں کھول کر دیکھے۔ ناصر کو بچپن میں ایک چوٹ آئی تھی جس کا نشان اس کے پاؤں پر رہ گیا تھا۔ مجھے جو لاش دکھائی گئی اس پر وہ نشان نہ تھا۔ میں نے اُس لاش کو اپنے بیٹے کی لاش ماننے سے انکار کر دیا۔"

حسن ناصر ناز و نعم کی گود میں پلا تھا۔ حیدر آباد دکن کے جس خوشحال گھرانے سے حسن ناصر کا تعلق تھا اُس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حسن ناصر ولایت میں اعلیٰ تعلیم پائے اور واپس آکر بڑے عہدے پر فائز ہو لیکن حسن ناصر کی حساس طبیعت نے اس زندگی کو

قبول کرنا گوارانہ کیا بلکہ دولت اور محنت، ظلم اور انصاف اور جبر اور جمہوریت کی جنگ میں اس نے ان قوتوں کا ساتھ دینا مناسب سمجھا جو معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتی ہیں اور محنت کشوں کا اقتدار قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ زندگی بھر انہیں کے حقوق کے لیے لڑتا رہا اور بالآخر انہیں کی خاطر شہید ہوا۔

جن ظالموں کے ہاتھ حسن ناصر کے خون سے آلودہ تھے وہ مدت ہوئی خاک کا رزق ہو چکے ہیں۔ اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں، حتیٰ کہ اُن کے اقربا بھی اُن کا نام لیتے شرماتے ہیں مگر حسن ناصر آج بھی زندہ ہے کیونکہ اُس نے جن آدرشوں کی خاطر جان دی وہ زندہ ہیں، اُس کی درویشی اور دردمندی، اُس کے حوصلے اور ہمت، اُس کی محبت اور وفا کیشی، اُس کے خلوص اور ایثار کی داستانیں آج بھی ہمارے دِلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہیں اور ہم اُس عظیم خاتون کی جرأت اور عزم کو جُھک کر سلام کرتے ہیں جس نے قوم کو ایسا فرزند عطا کیا۔

ایک شام شری متی اندرانی دھن راج گیر اور ان کے شوہر نامدار شری ششندر شرما کی صحبت میں گزری۔ اندرانی دیوی روسائے دکن کے ایک پرانے ادب نواز خاندان کی نورِ نظر ہیں۔ آبائی محل میں رہتی ہیں مگر جھونپڑیوں کا خواب دیکھتی ہیں۔ انگریزی میں شعر کہتی ہیں حالانکہ خود حافظ شیرازی کی مجسم غزل ہیں۔ ان کا غائبانہ تعارف تو مخدوم کے مجموعے "بساطِ رقص" کے ذریعے ہو چکا تھا جس میں اندرانی دیوی کی دو نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں البتہ ملاقات اب کے پہلی بار ہوئی اور جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اندرانی دیوی محل کے جس گوشے میں رہتی ہیں وہ دکنی تہذیب کے امیرانہ لوازم سے سجا ہوا ہے۔ آسمانی رنگ کی نیلی چھت جس پر ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے طلائی نقش و نگار، بلوری جھاڑ فانوسوں میں برقی شمعیں روشن، ایرانی قالین اور افرنگی صوفے لیکن پرانی وضع کے، جو مشرقی مذاق کو گراں نہ گزریں۔ غرض یہ کہ

بہشت کے اس گوشے میں ذوقِ نظر کی تسکین کا پورا سامان موجود تھا اور کام و دہن بھی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن وہاں بجلی کے پنکھے نہ تھے اور ہم گرمی میں پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ ہمارا کوئی ارادہ جہنم میں جلنے کا نہیں ہے لہٰذا دِل ہی دل میں سوچتے رہے کہ اگر بہشت میں بھی ایسا ہی ماحول ملا اور بجلی کے پنکھے نہ ہوئے تو زندگی کیسے بسر ہوگی۔ اپنے اندیشے کا اظہار چپکے سے شہاب سے کیا تو وہ بولا: "جنت میں تو ایر کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں"۔ ہم نے کہا "پھر اندرانی جی ایر کنڈیشنر کیوں نہیں لگواتیں"۔ اس نے جواب دیا: "اُن کو گرمی نہیں لگتی"۔ اور واقعی میں نے دیکھا کہ اندرانی جی اور شری ششندر دونوں آرام سے بیٹھے تھے۔ ان کی پیشانیاں عرق آلود نہ تھیں۔

شری ششندر تلگو کے مشہور شاعر اور نقاد ہیں۔ اب تک ان کی ۴۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو اپنی تین تصانیف عنایت کیں۔ ایک مجموعہ تلگو نظموں کا جن کا ترجمہ خود انہوں نے انگریزی میں کیا ہے، دوسری انگریزی خطوط کا مجموعہ جس میں عوام اور ادب کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور تیسری "میری دھرتی میرے لوگ" جو ان کی جدید رزمیہ نظم ہے، اس کا ترجمہ جناب اختر حسن نے اُردو میں کیا ہے۔

اندرانی دیوی زیادہ وقت اُردو ہی میں گفتگو کرتی رہیں۔ وہ پریم چند سیمینار میں شریک ہونا چاہتی تھیں لیکن تاریخ کے بارے میں دھوکا ہوا اس لیے نہ جا سکیں۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی نظمیں اُن کی زبان سے سنوں مگر فرمائش کی جرأت نہ ہوئی۔ اُردو کی شاعر ہوتیں تو ہم کو کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی وہ خود سنانے لگتیں اس لیے کہ اُردو شاعر اپنا کلام دوسروں پر مسلط کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ شعر نہ سنائے تو شاید اس کا کھانا ہضم نہ ہو اور ہم تو وہ سخت جان ہیں جس نے لکھنؤ میں ایک شاعر صاحب کے اخباری اداریے نثر میں سُنے اور اب تک زندہ ہیں۔ افسوس ہے کہ انگریزوں میں مشاعرے کا رواج نہیں

ہے لہٰذا انگریزی کے شاعر نجی محفلوں میں بھی اپنے شعر شاذ و نادر ہی سُناتے ہیں اور نہ ہم سخن فہم، نہ سخن ور، پھر اندرانی دیوی ہم کو کیوں سناتیں البتہ انہوں نے بھی اپنی دو تصانیف عنایت کیں۔

بعض اوقات جو اُلا مکھی پہاڑ کی چوٹی پر برف جم جاتی ہے اور سادہ لوح سمجھتے ہیں کہ پہاڑ کا دل بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے، ان کو کیا خبر کہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور جب پھوٹتا ہے تو اس کی ہیبت ناک آتش فشانی سے موت بھی لرز اٹھتی ہے۔ اندرانی دیوی کی رفتار و گفتار میں اتنا ٹھہراؤ تھا، ان کا چہرہ اتنا پُر سکون تھا کہ مجھ کو ان کی روح کے ہیجان و اضطراب کا اندازہ نہ ہو سکا اور نہ ان کے شاعر ذہن میں جذبات و احساسات کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس کی تمازت محسوس ہوئی بلکہ بار بار یہی خیال آتا کہ یہ آسودہ حال خاتون لاکھ دل کش سہی مگر شعر کیا کہتی ہوں گی۔ دردمندی ان کی خو کیوں ہو اور زندگی کی المناکیوں سے ان کو کیا سروکار لیکن ان کی نظمیں پڑھیں تو اپنی بدظنی پر سخت ندامت ہوئی۔

ان کی نظم PARTINGS IN MIMOSA علامتی ہونے کی وجہ سے مشکل سے گرفت میں آتی ہے۔ موسا کو ہماری زبان میں چھوئی مُوئی کہتے ہیں...... اس ننھے سے پودے کی پتّیاں عشقِ پیچاں کی طرح بہت باریک اور نازک ہوتی ہیں۔ اُن کو چھوؤ تو وہ لجا کر اپنا بدن سیکڑ لیتی ہیں، کہتی ہیں ہم کو بس دُور سے دیکھو۔ چھوؤ گے تو ہم مُرجھا جائیں گے۔ پھر تھوڑی دیر میں ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہے اور ان کی شرم کی چادر سرکا دیتا ہے۔ پتّیوں کے لب دوبارہ کھل جاتے ہیں اور پلکیں جھپکنے لگتی ہیں مگر اندرانی دیوی کی نظم میں موسا کوئی درخت ہے جس کے تلے دو دِل ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے موسا سے ہم واقف نہیں، ممکن ہے یورپ میں ہوتے ہوں۔

یہ نظم وقت کے محور پر گھومتی ہے۔ وقت جو ابدیت کے دوش پر سوار، مقام و

منزل سے بے نیاز، گردشِ لیل و نہار کے منظر دکھاتا اور فنا اور بقا کے اسرار بتاتا ہستی کے سینے میں اُترتا اور کائنات کی پہنائیوں میں حل ہوتا، تاریخ کے ورق الٹتا اور تہذیب کو جلاتا مارتا، انسانی شعور کو بیدار کرتا اور تحصیلِ ذات کے امکانات روشن کرتا گزر جاتا ہے لہٰذا زندگی کے بدلتے ہوئے موسموں کی تگ ودو، حیاتِ بشر کے سفر میں بہار و خزاں کی آویزشیں اور عرفانِ ذات کی جستجو سب وقت ہی سے وابستہ ہیں۔

ان کے دوسرے مجموعے POEMS OF NATIONAL MEMORY کی نظمیں اگرچہ بے حد جذباتی ہیں لیکن عام فہم بھی ہیں اور بہ اعتبار معنی موسا والی نظم سے مختلف بھی۔ موسا والی نظم میں اندرانی دیوی افسانۂ غم آفاق کی بوقلمونیوں کے حوالے سے بیان کرتی ہیں مگر "قومی یادوں میں انسان کا دُکھ ہے"۔ "جن کی زندگی عبارت ہے آسمان کی کھلی چھت کے نیچے غربت اور بھوک سے"۔ یہ نظمیں قومی یادیں ہیں۔ "یادیں جو فقط میری نہیں ہیں اور نہ محض میرے اندر کے شاعر کی ہیں بلکہ قومی حافظہ تو تاریخ کے ہر لمحے کو یادوں کی زمین پر پڑنے والے ہر قدم کے نشان کو محفوظ کر لیتا ہے۔ میرا برِاعظم اور اس کے باسی اجتماعی حافظے میں محو ہو کر ایک ہو جاتے ہیں اور مشترکہ درد میں شریک ہو جاتے ہیں"۔ اور شاعر جس کو اس تاریخی حقیقت کا شعور ہے، اپنے کلام میں لوگوں کے اجتماعی شعور کو اپنی علامت بنالیتا ہے۔ ہر ملک کا ادب اپنے زمانے کے واقعات ہی قلمبند نہیں کرتا بلکہ انسانوں کی تقدیر اور اُن کے کردار کی ازسرِ نو تشکیل بھی کرتا ہے۔

اندرانی دیوی کی یہ نظمیں دراصل فردِ جرم ہیں اُس سماجی نظام کے خلاف جو ہزاروں برس سے ہم پر حاوی ہے اور جس نے انسان سے اس کی انسانیت، اس کی انفرادیت، اس کی خودی سب چھین لی ہے۔ ان کے نزدیک "یہ صدی اندھی صدی ہے، بصیرت سے محروم جس میں بھوک اُگتی ہے۔ بھوک کے پھول کثرت سے کھلتے ہیں جنگل

کی طرح گنجان، باغ کی طرح بھرپور۔ ان کی آرزو ہے کہ ”میرا قلم کسی بھوکے پیٹ کا خاکہ کھینچ سکے، ایک بھوکی صدی کی سچی تصویر۔ میں ناپختہ انسانیت کی تصویریں بناتی رہوں، لکھتی رہوں یہاں تک کہ یہ صدی بول اُٹھے اپنی ناانصافیوں کے جواب میں۔“

ان کے ضمیر میں پوشیدہ بھوکا انسان کہتا ہے کہ ”آسمان میرا سانس ہے۔ میرا گھر ہے، میں ایک پر شکستہ پرندہ ہوں جو زمین پر رینگتا ہے۔ یہاں میری انتڑیوں میں بھوک ایک بدنما عجیبی پھول کی مانند اندر ہی اندر اُگتی ہے، بھوک، جس کی کوئی شکل نہیں، کوئی جسم نہیں، کوئی نام نہیں کیونکہ اس کو نام کبھی نہیں ملا، البتہ بھوک نے، جس کی کوئی شکل نہیں، کوئی جسم نہیں، اس صدی کو نام دے دیا ہے۔ اس نے توبرّاعظموں کو بھی نام دیا اور میں ایسے ہی ایک برّاعظم کا باسی ہوں جہاں لاشیں کتب خانوں کے اردگرد لٹائی جاتی ہیں اور حنوط شدہ انسان چڑیا گھروں میں دفن ہوتے ہیں۔ بھوک ہمارے ضمیر کی بولتی دستاویز ہے، ہمارے عہد کی سچی آپ بیتی، بالخصوص اس برّاعظم کی، پس ہم اپنے اصلی چہرے کو کیوں چھپائیں؟“

”مکروہ چہرے، مجروح چہرے، قابلِ نفرت چہرے، زخموں سے لہولہان اور زمانے کے ہاتھوں بدنام اور رُسوا چہرے۔“

لیکن شاعر کا زخمی ضمیر کراہتا نہیں بلکہ للکارتا ہے۔ ”ہم ان غاروں میں کیوں رہیں۔ دُکھ کے آنسو کب تک بہائیں گے اور کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ درد کے اِن دنوں کو احتجاج بن کر پھوٹنے سے کب تک روکتے رہیں گے، احتجاج کو کب تک اپنا وجود نہ بنائیں گے......

”میرے لوگو!

ہماری جدوجہد زندگی کی خاطر ہونی چاہیے۔

انسانی وقار کی بحالی کی خاطر

تمہارے جلال کو مجروح ہستی کے پنجرے سے باہر آنا چاہیے
اور کھلے آسمان میں
خواہشوں کے شہباز کی مانند پرواز کرنا چاہیے
وقت سے ان وعدوں کو جھپٹ کر چھیننے کی خاطر
اس کے چہرے کی جھوٹی نقاب کو ہمیشہ کے لیے نوچ پھینکنے کی خاطر۔

حیدر آباد میں جس کسی سے ملاقات ہوئی اُس نے پہلا سوال یہی کیا کہ بتاؤ تم کو پرُانے اور موجودہ حیدر آباد میں کوئی فرق دکھائی دیا یا نہیں۔ سوال معقول تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ حرکت و تغیر قدرت کا وہ آفاقی قانون ہے جس سے انسان، حیوان، نباتات، جمادات کوئی بھی بَری نہیں۔ یہی حال شہروں کا ہے خواہ وہ حیدر آباد دکن ہو یا حیدر آباد سندھ لیکن گزشتہ ۳۵ برس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کو عالمی تغیرات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ دوسری جنگِ عظیم کا آخری زمانہ بڑے ہل چل کا زمانہ تھا۔ سوویت یونین نے ہٹلری درندوں کا سر کچل کر دنیا کو انسانیت، امن، آزادی اور جمہوریت کے سب سے خطرناک دشمنوں سے بچالیا تھا۔ حریّت پسندوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ ایشیا اور افریقہ کی محکوم قومیں جاگ اٹھی تھیں اور ہندوستان میں ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ انگریزوں کے دن اب تھوڑے ہیں۔ دیسی ریاستوں کی رعایا بھی نئے عزم کے ساتھ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ چنانچہ حیدر آباد میں بھی ٹریڈ یونینوں، کسان سبھاؤں، طلبا کی تنظیموں، ادبی انجمنوں اور سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔

۱۹۴۵ء تک حیدر آباد کا سب سے اہم سیاسی مسئلہ یہ تھا کہ قانونِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے مجوزہ وفاق میں شامل ہو جائے یا نہیں لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہونے کے بعد جب حیدر آباد کا الحاق ہندوستان میں ہو گیا تو یہ بحث خود بخود ختم ہو گئی البتہ ریاست کی جغرافیائی وحدت باقی رہی مگر ۱۹۵۶ء میں جب ہندوستانی صوبوں کی لسانی بنیادوں پر

از سرِ نو تشکیل ہوئی تو ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ نہ بمبئی اور مدراس کے پرانے صوبے رہے اور نہ ریاستیں رہیں، اس طرح آندھرا پردیش کی نئی ریاست وجود میں آئی اور حیدر آباد اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اب وہاں ہر پانچویں سال صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوتے ہیں (ایک بالغ فرد ایک ووٹ) اور اکثریتی پارٹی حکومت کرتی ہے۔

ان تبدیلیوں کا اثر ریاست کی معیشت، سیاست اور ثقافت، ہر شعبۂ زندگی پر پڑا ہے۔ مشاغل اور میلانات بدلے ہیں، تخلیقی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوا ہے، ذہنوں کے افق پر نئی روشنیوں کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور لوگوں کے رہن سہن، مذاق و مزاج میں بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً آصف جاہی دور میں نظام دکن کی سادہ زندگی کے باوصف ظاہرہ ٹھاٹھ باٹھ پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اعلیٰ سرکاری افسروں اور امراءِ ریاست کی کوٹھی پر اگر موٹر میں نہ جاؤ تو باریابی مشکل سے ہوتی تھی۔

شہر میں موٹروں کی تعداد شاید کلکتہ، بمبئی سے بھی زیادہ تھی۔ جاگیرداروں کا بال بال مقروض تھا مگر شان و شوکت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے سے باز نہ آتے تھے۔ بنجارہ ہل کی نئی طرز کی عالی شان کوٹھیوں کا جواب تو پورے ملک میں کیا، ایشیا میں بھی نہ تھا۔ دولت کی جھوٹی نمائش سب کا وطیرہ تھی۔ یہ زہر نچلے طبقوں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ "پیام" کے خوش نویس جن کی ماہانہ تنخواہ چالیس پچاس روپے سے زیادہ نہ تھی ۵ پی مارکہ لٹھے کا پاجامہ پہنتے تھے جو ہم کو بھی میسر نہ تھا۔ خوش پوشاکی اور خوش خوراکی حیدر آباد کا طرۂ امتیاز تھی۔ زندگی کی ان قدروں میں اب بڑی خوش آئند تبدیلی آئی ہے۔ یہ درست ہے کہ وزیر اور امیر وہاں اب بھی ہیں اور دولت مندوں کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ ہے لیکن جمہوریت اور مساوات کی قوتوں کے دباؤ کے تحت اور رائے عامہ کے خوف سے اربابِ اقتدار میں اب وہ پہلی سی رعونت باقی نہیں رہی۔ شاید اس سبب سے بھی عنانِ اقتدار اب جن کے ہاتھوں میں ہے اُن کی سیاسی ذہنیت اور تہذیبی روایت

جاگیردارانہ نہیں ہے۔ لوگ جاہ و دولت کے حصول کے اب بھی کوشاں رہتے ہیں لیکن دولت کی نمائش کا وہ پہلا سا جنون اب باقی نہیں رہا بلکہ عام رجحان اب سادگی کی طرف ہے۔ میں نے وہاں کسی کو سوٹ پہنے نہیں دیکھا۔

آصف جاہی دربار کا لباس دستار اور بگلوس تھا لیکن زیادہ تر لوگ چوڑے کالر کی شیروانی اور چھوٹی مہری کا پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ اِکّادُکّا گاندھی ٹوپی یا رامپوری کشتی نما ٹوپی بھی نظر آجاتی تھی۔ اب یہ لباس سرے سے غائب ہے۔ قریب قریب ہر شخص بشرٹ اور پتلون پہنتا ہے یا کرتا پاجامہ۔ پتلون اور بشرٹ اب ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں شہریوں کا لباس بن گیا ہے۔ شاید موسم کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ مجھ کو اپنے پورے قیام کے دوران بس ایک ترکی ٹوپی نظر آئی۔ وہ تھی بزرگ حبیب الرحمٰن صاحب کے سر پر۔ گاندھی ٹوپی اور رامپوری ٹوپی پر بھی یہی اُفتاد پڑی ہے۔ شیروانیاں بھی بس گنتی کی تین چار دکھائی دیں۔

افلاطون نے ڈھائی ہزار برس پہلے کہا تھا کہ ہر شہر میں دو شہر بستے ہیں۔ ایک امیروں کا شہر دوسرا غریبوں کا۔ یہ کلیہ آج بھی درست ہے اور حیدر آباد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ غریبوں کے علاقے ویسے ہی ہیں جیسے غریبوں کے ہوتے ہیں۔ گندے گنجان اور اندھیرے جہاں مکھیاں ہر وقت بھنبھناتی رہتی ہیں اور مچھر، کھٹمل، محنت کشوں کا بچا کھچا خون پیتے رہتے ہیں۔ آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور بہت سی نئی نئی بستیاں بن گئی ہیں چنانچہ شہر اب بنجارہ ہل تک پھیل گیا ہے جو ایک زمانے میں امرا کا مخصوص علاقہ تھا۔ حیدر آباد میں سائیکلوں کا رواج پہلے بھی بہت تھا، شاید ہندوستان کے ہر شہر سے زیادہ اور آج بھی کثرت کا وہی عالم ہے، البتہ نئی چیز یہ دیکھی کہ نئے پُل پر ٹرافک کی سہولت کے مدِ نظر راہگیروں، سائیکل سواروں اور موٹر نشینوں کے لیے الگ الگ راستے کر دیے گئے ہیں۔ ایک لعنت جس سے حیدر آباد محفوظ تھا اب عام ہو گئی ہے، وہ لعنت سائیکل رکشاؤں کی

ہے۔ یہ انسان دشمن بلکہ جان لیوا سواری حیدر آباد کے خوبصورت اور مہذب شہر کے چہرے پر کوڑھ کے داغ سے کم نہیں۔ غریب رکشا والا پیٹ کی خاطر دو دو، تین تین سواریوں کا بوجھ لادے پسینے میں شرابور میلوں دوڑتا ہے۔

حیدر آباد میں صنعتی کارخانے آصفی عہد ہی میں لگنے شروع ہو گئے تھے اور اب تو یہ سلسلہ بہت پھیل گیا ہے۔ جگہ جگہ فیکٹریاں اور ملیں کھڑی ہیں، البتہ ایک صنعت کا ذکر سن کر بڑی حیرت ہوئی اور وہ ہے انگوری شراب کی صنعت۔ ہوا یوں کہ کسی زمیندار نے حیدر آباد کے مضافات میں انگور کی چند بیلیں شوقیہ لگائیں۔ انگور خوب پھلا، اس کی دیکھا دیکھی اوروں نے بھی یہی تجربہ کیا جو کامیاب رہا، پھر کیا تھا حیدر آباد سے محبوب نگر تک کا علاقہ تاکستان بن گیا اور انگور کے باغ ہزاروں ایکڑ تک پھیل گئے۔ کہتے ہیں اس خطّے کی زمین جو سُرخ ہے (اس مٹی کو جلکا کہتے ہیں) انگور کی کاشت کے لیے بہت موزوں ہے۔ انگور چونکہ بہت میٹھے اور لذیذ ہوتے ہیں لہٰذا صنعت کاروں نے حیدر آباد میں انگور کی شراب کی فیکٹریاں قائم کر دیں۔ ایک فیکٹری فرانسیسی ماہرین کی نگرانی میں بھی چلائی گئی تھی جس میں شیری اور سُرخ اور سفید وائن انگور سے تیار ہوتی تھیں لیکن وہ بند ہو گئی البتہ گولکنڈہ وائن اب بھی بنتی ہے۔ دوستوں سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ ان سیندھی خانوں پر کیا گزری جو شہر کے باہر کاروبار کر رہے تھے اور جہاں پردہ پڑی ہوئی موٹریں رات کے اندھیرے میں قطار در قطار کھڑی رہتی تھیں۔

حیدر آباد میں بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح ٹرافک کا ہجوم رہتا ہے۔ پرانی وضع کے تانگے اب شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بھی اندرونِ شہر میں۔ موٹروں، بسوں، ٹرکوں، رکشوں اور سائیکلوں کی ریل پیل رہتی ہے، غرض کہ اعصاب شکنی کے تمام اسباب موجود ہیں۔ اس کے باوجود یہ نہیں محسوس ہوتا کہ لوگ جلدی میں ہیں۔ ان کے چہروں پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نہیں دکھائی دیتے اور نہ ان کی چال ڈھال سے

یہ پتہ چلتا ہے کہ بھاگم بھاگ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ماسکو، لندن اور نیویارک وغیرہ میں موٹروں کا تو ذکر کیا راہگیر بھی اس رفتار سے چلتے ہیں گویا دوڑ رہے ہوں، گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ شاید اس وجہ سے کہ وہاں سردی بہت ہوتی ہے اور لوگ تیز تیز چل کر خون میں گرمی پیدا کرتے ہیں۔ یہ تیز رفتاری اب ان کی فطرت بن گئی ہے اور صنعتی زندگی کی رفتار کے عین مطابق ہے لیکن ہم لوگ دھوپ اور گرمی کی شدت کے باعث تیز چلنے کے عادی نہیں ہیں کیونکہ یہاں تیز چلنے سے پسینہ آتا ہے اور جسم جلد تھک جاتا ہے۔ مجھ کو حیدر آباد کا ماحول بہت RELAXED نظر آیا، اس میں تناؤ نہیں تھا۔ کام ہر شخص کرتا ہے مگر آرام آرام سے، لوگ بھلے مانسوں کی طرح چلتے ہیں دوڑتے نہیں۔ باتیں کرتے ہیں چیختے نہیں، کوئی کچھ کہے مجھے تو ان کی یہ نرم روی اور شائستہ خرامی بہت اچھی لگتی ہے۔

اہل دکن کو اپنی تہذیبی انفرادیت پر بجا طور پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ زمین سے وابستگی اور اپنے ماضی سے محبت ان کی دیرینہ روایت ہے جس میں پچھلے تین چار دہاڑوں میں نئی نئی شاخیں پھوٹی ہیں، چنانچہ پرانے معاشرے اور ادب کی تلاش و تحقیق کی جو دھن مجھ کو حیدر آباد میں نظر آئی اس کی مثال ملک کے دوسرے حصوں میں مشکل سے ملے گی۔ ایسے ایسے صوفی منش ادیبوں اور عالموں کے تذکرے شائع ہو رہے ہیں جن کے میں نے کبھی نام بھی نہیں سُنے تھے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی نئی تصنیف سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ عنایت کی۔ یہ ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسس تھا۔ یہ کتاب دکھنی زبان، دکھنی ادب اور دکھنی تصوّف پر بڑی معلومات افزا تصنیف ہے۔

ہمارے صوفیوں سنتوں نے بلا لحاظِ ملّت و مذہب انسان سے محبت کرنے اور رواداری برتنے کی جو ریت قرونِ وسطیٰ میں ڈالی تھی حیدر آباد میں وہ آج تک زندہ ہے۔ اب کے اتفاقاً دسہرہ اور بقر عید کا ملاپ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے دہلی، مراد آباد، علی گڑھ

اور الہ آباد کی فضا خاصی مکدر رتھی۔ میرے دوستوں نے دہلی میں مشورہ دیا تھا کہ تم یہاں نہ ٹھہرو حیدر آباد چلے جاؤ۔ میں حیدر آباد پہنچا تو وہاں نہ کسی قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں اور نہ میں نے کسی سرکاری یا غیر سرکاری صحبت میں کسی کو فساد کا اندیشہ ظاہر کرتے دیکھا۔ دونوں تیوہار ہنسی خوشی گزر گئے نہ کسی کا سر پھوٹا نہ کہیں آگ لگی۔ گنگا، جمنا اتر پردیش میں بہتی ہیں لیکن ان کے پانی میں اب خون کی بو آتی ہے، البتہ گنگا جمنی تہذیب کی اگر بہار دیکھنی ہو تو آپ کو دکن جانا ہوگا جہاں شرپسندوں کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود تہذیب کے سنگم میں شگاف نہیں پڑسکا ہے۔ کبیر داس اور امیر خسرو کے سچے وارث دراصل دکن کے لوگ ہیں نہ کہ اتر پردیش کے سپوت، جو بھوک، بیماری، بیروزگاری اور افلاس جیسے مشترک دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے بجائے ایک دوسرے کا خون بہا کر اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔

حیدر آباد وہ شہر ہے جس کو محبت نے جنم دیا اور عشق نے پالا پوسا۔ یوں تو وہاں کا ہر گوشہ تاریخ کا ورق ہے جس کو اہلِ دکن جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں مگر بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ مثلاً سالار جنگ کی ڈیوڑھی جو تاریخی عمارت تھی اور بلا مبالغہ میلوں کے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بار کسی کے توسط سے میں نے اور مخدوم نے نواب کے محل اور کتب خانے کی سیر کی تھی اور نوادر و عجائبات کو دیکھ کر ہماری آنکھیں کھل گئیں تھیں لیکن اب وہاں کچھ اور ہی عالم ہے۔ محل کے بیچوں بیچ سڑکیں بن گئی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف دکانوں کی بھرمار ہے، پولیس کمشنر کے دفتر اور سٹی عدالتوں کی نئی عمارتیں حویلی کے احاطہ ہی میں ہیں۔ فقط چار دیواری کے کچھ حصے اور دو ایک پھاٹک ماضی کی یادگار باقی رہ گئے ہیں۔ محل کے جو حصے ورثا کے قبضے میں ہیں ان کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں، چھتیں بیٹھ گئی ہیں اور کڑیاں گر رہی ہیں۔ رنگ و روغن سب مٹ چکے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ حویلی فیوڈلزم کی شکست و ریخت کی زندہ تصویر ہے۔

نواب سالار جنگ لاولد مرے۔ لطف یہ کہ اپنی زندگی میں انہوں نے نہ کوئی ٹرسٹ قائم کیا نہ وصیت نامہ لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ریاست کے سینکڑوں دعویدار پیدا ہو گئے۔ کوئی بیٹا بنا، کوئی بھتیجا، کوئی بھانجہ۔ اور منکوحہ وغیر منکوحہ بیویوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔ برسوں مقدمہ چلا اور آخر کار جائیداد کا بٹوارہ ہوا۔ ریاست کی مالیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک پائی کے حصہ دار کو نو لاکھ روپے ہاتھ لگے۔

البتہ یہی غنیمت ہے کہ حکومت نے سالارِ جنگ میوزیم تعمیر کر کے ان کے پشتہا پُشت کے نوادر کو ایک جگہ محفوظ کر دیا ہے۔ یہ میوزیم موسیٰ ندی کے کنارے واقع ہے لیکن فن تعمیر کا بہت بھونڈا نمونہ ہے اور آس پاس کی آصف جاہی دور کی پُر شکوہ عمارتوں سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ دراصل اب کسی شہر میں خواہ وہ ہندوستان کا شہر ہو یا پاکستان کا، یادگاری عمارتیں تعمیر کرتے وقت مشرقی روایتوں کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا، ساری توجہ افادیت پر صرف ہوتی ہے۔ عمارت کے ظاہرا حسن و دلکشی کے تقاضوں کو یک لخت نظر انداز کر دیا جاتا ہے چنانچہ ہر نئی عمارت خواہ وہ دلّی میں ہو یا کراچی میں کبوتروں کا فلک نما کابک نظر آتی ہے۔ نیویارک سے ٹوکیو تک یہ بدعت عام ہے۔ البتہ سوویت یونین اس بیماری سے محفوظ ہے۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، مرو، خیوا اور عشق آباد میں عجائب گھروں، تھیٹروں، کتب خانوں اور یونیورسٹیوں کی عمارتیں ساسانی، سلجوقی، خوارزمی اور تیموری عہد کی تاریخی عمارتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان کے گنبد و محراب، ستون، دروازے اور دیواروں، چھتوں کے نقش و نگار سب مشرقی روایت کے عین مطابق ہیں۔ اسی کے ساتھ عمارت کا اصل مقصد بھی فوت نہیں ہوا ہے۔ سالار جنگ میوزیم کے معماروں نے کاش جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں ہی کو غور سے دیکھ لیا ہوتا تو وہ اتنی بدمذاقی سے کام نہ لیتے۔

گلاس آدھا بھرا ہو اور آدھا خالی تو یہ بات دیکھنے والے کی چشم بصیرت پر منحصر ہے

کہ وہ گلاس کو آدھا بھرا ہوا کہے یا آدھا خالی کہے کیونکہ دونوں باتیں سچ ہوں گی، یہی صورتِ حال حیدر آباد کی ہے۔ وہاں نہ ہر گھر میں ہُن برستا ہے نہ ہر گھر میں فاقہ ہوتا ہے۔ وہاں کے عوام اُسی کشاکشِ ہستی سے دوچار ہیں اور اُنہیں آلام و مصائب میں مبتلا ہیں جو ابھی تک پورے مشرق کا مقدر ہیں۔ مگر وہ اپنے مقدر پر صابر و شاکر نہیں ہیں نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی نجات دہندے کا انتظار کر رہے ہیں بلکہ دن رات جدوجہد میں مصروف ہیں اور اپنے حالاتِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بالآخر خوابِ سحر کا لطف ختم ہوا اور رُخصت کی گھڑی آن پہنچی۔ دوستوں نے ایرپورٹ پر گلے مِل مِل کر خدا حافظ کہا اور میں حافظؔ شیرازی کا یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز کی جانب روانہ ہوا کہ۔

یارب اماں دہ تا باز بیند
چشمِ محبّاں رُوئے حبیباں

آزادی سے قبل کے سالوں میں مسلمانانِ ہند پر حیدرآباد دکن کا سحر طاری تھا۔ یہ ایک دلفریب، خوابوں بھری دنیا تھی جو عباسی خلفا کے بغداد کے طلسمی ماحول کی یاد تازہ کرتی تھی۔۔۔ سبطِ حسن کی کتاب اس زمانے کے حیدرآباد میں ہونے والے اُن اخلاقی اور ذہنی تغیرات کا ریکارڈ ہے جن کا وہ خود بھی ایک حصہ تھے۔ جاگیردارانہ استحکام اور جمود کے شکار اس خوابیدہ جزیرے میں وہ اس وقت وارد ہوئے جب باقی ہندوستان زبردست سیاسی کایا کلپ سے گزر رہا تھا۔ پوری دنیا اس بحران سے دوچار تھی کہ جو جنگِ عظیم دوئم کی ہولناکیوں پر منتج ہونے والا تھا۔۔۔ آصف جاہی خاندان کا حیدرآباد تو اب گمنامی میں جا چکا لیکن تیس کی دہائی میں جب کہ سبطِ حسن وہاں پہنچے، جو نئی ثقافتی اقدار وہاں جنم لے رہی تھیں وہ نئے حیدرآباد اور ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں بھی پہنچتی رہیں۔ ان اقدار کا ایک نمائندہ وہ بذاتِ خود تھے۔ جس آزادروی اور روشن خیالی کا انہوں نے وہاں اکتساب کیا، اس کی زندہ جاوید روایت کو وہ اس کتاب کے ذریعے ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں حسین لوگوں، اور حسن کی تخلیق کرنے والوں کے ایک عہدِ پارینہ کا نا قابلِ شناخت و نادر ہی نظر آتا ہے۔ پاکستانی صحافت میں ان کا کام نئے انداز کے پہلے ہفت روزہ 'لیل و نہار' کے بانی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مزید برآں ہمارے سماج و ثقافت کے تاریخی پہلوؤں پر ان کی شاہکار کتابیں اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں۔

زینو ڈان، ۸ مارچ ۱۹۸۵ء

یہ ایک ایسی سنجیدہ موضوع کی حامل مگر دلچسپ، رومان پرور، معلوماتی کتاب ہے جسے قاری ایک دفعہ شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دکن کی خوشگوار یادوں کے نام معنون ہے۔ اس میں اس معاشرہ کا تذکرہ ہے جو اب قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ کتاب دیکھ کر ہمیں بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را ‏ ‏ ‏ ‏ گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را

اس کے مطالعہ کے بعد درحقیقت یادوں کے داغ لو دینے لگتے ہیں اور ایک کیف آگیں جذباتی آنچ کا احساس رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔

مصنف نے حیدرآباد کے معاشرے اور تہذیب اور رسم و رواج کی نسبت اپنے مشاہدات بے حد فنکارانہ انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مصنف نے کسی بات کے بیان میں بھی لگی لپٹی سے کام نہیں لیا۔ اپنی رائے کا پوری بے باکی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ عیوب و اوصاف کے تذکرے میں کسی ہچکچاہٹ یا اجتناب کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی مصنف کا خلوص اور انسان دوستی اور ترقی پسند قوتوں سے اس کی ہمدردی اور تائید کتاب میں ہر مقام پر نمایاں ہے اور ہر واقعہ کے بیان سے مترشح ہوتی ہے۔

ماہنامہ 'پگڈنڈی' امرتسر، جون ۱۹۶۷ء